Regd. L. No.7243 Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مئی 1976

اقبالؒ اور سوشلزم

(۱) میرے افکار کو بالشوزم سے منسوب کرنا غلط ہے بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے ۔ میں مسلمان ہوں ۔ میرا عقیدہ ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین حل قرآن مجید نے تجویز کیا ہے ۔

(علامہ اقبالؒ کا خط مطبوعہ زمیندار مورخہ ۲۴ جون ۱۹۲۳ء)

(۲) سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے خلاف ہیں اور اسے افیون تصور کرتے ہیں ۔ میں مسلمان ہوں اور انشاءاللہ مسلمان مروںگا ۔ میرے نزدیک تاریخ کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے

(خواجہ غلام السیدین کے نام علامہ اقبالؒ کا خط
(مورخہ ۲۰ ۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء)۔

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ــــ ۱۸ روپے

غیر ممالک ــــ ۲ پونڈ

ٹیلیفون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ

۱½

ڈیڑھ روپیہ

جلد ۲۹ | مئی ۱۹۷۶ء | نمبر ۵

فہرست

۱۔ لمعات ــــــــــــــــ ۲

۲۔ متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی ــــ (محترم پرویز صاحب) ۹

۳۔ اسلامی نظریاتی کونسل کا سوالنامہ (بابت ربٰو) ــ (محترم پرویز صاحب) ۳۷

۴۔ باب المراسلات ــــــــــــــــ ۴۲

۵۔ نقد و نظر ــــــــــــــــ ۴۷

۶۔ حقائق و عبر ــــ (قرآن کے نام سے سرمایہ داری کی تبلیغ، مکے مدینے سے آواز آتی ہے، سب خوش رہیں، اب ہی حرفِ جنوں ... ، اب خدا کی باری آئی) ــــ ۴۹

۷۔ حیاتِ قائدِ اعظمؒ ــــــــــــــــ ۵۷

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقامِ اشاعت ۲۵/بی، گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

قرآن کریم نے قوموں میں انقلاب کے لئے دو نہایت گراں قدر، غیر متبدل، ابدی اصول دیئے ہیں۔ پہلا اصول یہ ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (۱۳/۱۱)۔ "خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا تاوقتیکہ وہ قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا کرے۔" قرآن کریم کے الفاظ کو دیکھئے۔ اور اس سے اس اصول کی محکمیت کا اندازہ لگائیے کہ اس نے کہا یہ ہے کہ خود وہ قوم یا دنیا کی کوئی طاقت تو ایک طرف، خدا بھی اُس قوم کی حالت کو نہیں بدلتا تاوقتیکہ وہ اپنے قلب ونگاہ میں (اپنی نفسیات میں) تبدیلی نہ پیدا کرے۔ اس کے بغیر جو تبدیلی بھی آئے گی وہ فساد ہوگا، انقلاب نہیں ہوگا۔ نظر بظاہر وہ تبدیلی ہوتی لیکن درحقیقت وہ تخریب ہوگی تعمیر نہیں، عارضی ہنگامہ آرائی ہوگی، صحیح بنیادوں پر اٹھی ہوئی مستحکم عمارت نہیں ہوگی۔ قرآن کریم کی رو سے قلب ونگاہ میں اس قسم کی صحیح تبدیلی مستقل اقدارِ خداوندی کو دلوں میں اتار دینے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی تبدیلی انقلاب کا جذبۂ محرکہ بنتی ہے۔ دل کے اندر سے اٹھا ہوا تعمیری تقاضا۔

قوموں میں انقلاب کے لئے دوسرا عظیم اصول ختمِ نبوت ہے۔ ختمِ نبوت کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ اب شخصیت پرستی کا دور نہیں رہا۔ زمانہ اصول پرستی کا آگیا ہے۔ کوئی تبدیلی شخصیتوں کے سہارے قائم نہیں رہ سکتی۔ وہ صحیح اصولوں کی بنیادوں ہی پر استوار ہو سکتی ہے۔ اور وہ اصول رسالتِ محمدیہ کی رُو سے مل سکتے ہیں جو ابدیت درکنار رہے۔

دنیا نے ان اصولوں سے انحراف، خلاف ورزی اور سرکشی اختیار کر کے دیکھ لیا کہ ایسی تبدیلی کا مآل کیا ہوتا ہے اور وہ کب تک قائم رہ سکتی ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال کمیونزم کے نظریہ اور سوشلزم کی رُو سے قائم کئے جانے والے نظام کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ روس میں اشتراکی نظام قائم ہوا تو دنیا میں تہلکہ مچ گیا کہ اب اقتصادی نظام میں ایک ایسا انقلاب پیدا ہو گیا ہے جو ابدیت درکنار ہے۔ دنیا کی کوئی قوت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لیکن اس تبدیلی کا جذبۂ محرکہ نفرت تھی اور اس کے قیام کا ذریعہ مارکس یا لینن کی شخصیت پرستی۔ نتیجہ یہ کہ ابھی چند ہی سال گزرنے پائے تھے کہ لینن کی وفات کے بعد، خود روس میں، اس نظام کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ اور

اس نے ایک بدترین قسم کی مستبد آمریت پر قائم شدہ قومی مملکت کی شکل اختیار کر لی۔ اس کے بعد لوگوں کی توقعات چین کے ساتھ وابستہ ہوئیں اور چونکہ ان لوگوں نے روس کے تجربے سے کچھ فائدہ اٹھایا تھا، اس لئے انہوں نے بڑی احتیاط سے سنبھل سنبھل کر قدم اٹھایا۔ لیکن اس قوم کی تبدیلی ماؤزے تنگ کی شخصیت کے ساتھ وابستہ تھی — وہ ماوزے تنگ کی پرستش کرتے ہیں اور اس کی "لال کتاب" کو مذہبی کتابوں سے بھی اونچا درجہ دیتے ہیں۔ قارئین کو یاد ہو گا کہ چین کے سلسلے میں پرویز صاحب نے ہمیشہ اپنے خطابات میں کہا کہ یہ سارا نظام ماوزے تنگ کی زندگی تک ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھئے گا کہ اس رشتہ کے ٹوٹنے سے جھاڑو کے یہ تنکے کس طرح بکھر جاتے ہیں۔ لیکن حیرت ہے — یا یوں کہئے کہ زمانہ اس برق رفتاری سے پہلو بدل رہا ہے کہ وہاں یہ انتشار خود ماؤزے تنگ کی زندگی میں شروع ہو گیا۔ ماوزے تنگ کے بعد وہاں کی ممتاز ترین شخصیت چو۔ این۔ لائی کی تھی۔ اہل چین کے ہاں اس کی بھی پرستش ہوتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین تیار کر دیا اور اسے اپنے بعد ممتاز ترین مقام پر فائز کر دیا۔ چو۔ این۔ لائی کی وفات پر اہل چین نے جس انداز سے اس کا ماتم کیا اس سے نظر آتا تھا کہ اس کے بعد یہ قوم اس کی جوتیوں تک کی بھی پرستش کرے گی۔ لیکن ابھی اس کی وفات کو چند ماہ بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ اس کی مخالفت میں ایک گروہ اٹھ کھڑا ہوا اور ایک دوسرے شخص کو چو۔ این۔ لائی کی جگہ دینے کے لئے میدان میں آ گیا۔ تماشہ یہ کہ اس دوسرے گروہ کی سربراہی خود ماوزے تنگ کر رہا تھا۔ گویا خود ماوزے تنگ کے پرستاروں میں سے ایک گروہ خود اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ ان متحارب گروہوں میں جو ہنگامے برپا کئے اس کی جستہ جستہ خبریں تو اخبارات میں آتی رہیں لیکن پانچ اپریل ۱۹۷۶ء کو اس سلسلے میں جو فسادات اور ہنگامہ آرائیاں ہوئیں اس کی تفصیلی رپورٹ پیکنگ کے روزنامہ (PEOPLE'S DAILY) کی ۸ اپریل ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی جو مبنی ہے وہاں کے مزدوروں، کسانوں، سپاہیوں کی رپورٹوں پر اور خود اسی روزنامہ اپنے نامہ نگاروں کی خبر رسانیوں پر۔ یہ رپورٹ روزنامہ ڈان (کراچی) کی ۱۸ اپریل ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے اور اس قابل ہے کہ اسے پورے کا پورا قارئین طلوع اسلام کے سامنے لایا جائے۔ اس کا اردو ترجمہ کراچی کے ایک طالب علم نے کیا ہے جو درج ذیل ہے:۔

"پانچ اپریل کو صبح کے وقت مٹھی بھر طبقاتی دشمنوں نے چنگ منگ تہوار کے دوران آنجہانی وزیر اعظم چو این۔ لائی کی یاد منانے کی آڑ لے کر دارالحکومت (پیکنگ) کے تین آن مین سکوائر میں ایک پہلے سے سوچے سمجھے منظم و مرتب منصوبے کے تحت ایک انقلاب دشمن سیاسی ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ انہوں نے کھلم کھلا رجعت پسندانہ تقریریں کیں، رجعت پسندانہ نظمیں اور نعرے دیواروں پر چسپاں کئے اور رجعت پسندانہ پمفلٹ تقسیم کئے۔ انہوں نے انقلاب دشمن تنظیمیں قائم کرنے کے حق میں مظاہرے کئے۔ عیاری سے کام لے کر اور انقلاب دشمن زبان استعمال کرتے

ہوتے، انہوں نے نہایت ڈھٹائی سے اعلان کیا کہ چین شیہ ہوانگ کا دور ختم ہوا۔ انہوں نے کھلم کھلا تنگ سیاؤ پنگ کی حمایت کا علم بلند کیا اور اپنے جنون میں ہمارے عظیم رہنما چیئرمین ماؤ کو بھی نشانہ بنایا۔ انہوں نے چیئرمین ماؤ کی سرکردگی میں قائم پارٹی کی مرکزی کمیٹی کو تقسیم کرنے اور توڑنے کی کوشش کی۔ انہوں نے یہ کوشش بھی کی کہ تنگ سیاؤ پنگ پر تنقید کرنے والی جدوجہد اور دائیں بازو کی طرف سے صحیح فیصلوں کو بدلنے والی منحرفانہ کوششوں کے خلاف جو موجودہ جدوجہد جاری ہے، اس کا رخ تبدیل کر دیا جائے۔ اس طرح یہ لوگ انقلاب دشمن سرگرمیوں میں مصروف رہے۔

یہ انقلاب دشمن سرگرمیاں ۵ اپریل کو نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ صبح تقریباً آٹھ بجے میونسپل پبلک سیکیورٹی بیورو کی ایک لاؤڈ اسپیکر والی گاڑی کو الٹ کر تباہ کر کے رکھ دیا گیا۔ نو بجے کے بعد دس ہزار سے زائد لوگ عظیم عوامی ہال کے سامنے جمع ہو گئے۔ اپنی انتہا پر تین آن مین سکوئر کا یہ ہجوم تقریباً ایک لاکھ افراد پر مشتمل تھا۔ اس میں مٹھی بھر تخریبی عناصر تھے اور اکثریت تماش بینوں کی تھی جو صورت حال کو دیکھنے جمع ہو گئے تھے کچھ لوگ عوامی ہیروز کی یادگار کے گرد جمع تھے۔ اکثریت البتہ سکوئر کے مغربی سمت میں عظیم عوامی ہال کے مشرقی دروازے کے سامنے جمع تھی۔ تقریباً درجن بھر نوجوانوں کو زدوکوب کیا گیا۔ ان کے سروں پر زخم آئے اور ضربوں سے ان کے چہرے سوج گئے جن پر خون بہہ رہا تھا۔

غنڈے چیخ رہے تھے کہ "ان کو جان سے ہی مار ڈالو" فوج کے ایک پہرے دار نے ان غنڈوں کو سمجھا بجھا کر رکنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کی وردی کے نشانات نوچ لئے گئے۔ وردی پھاڑ دی گئی اور مار مار کر اس کے چہرے کو لہولہان کر دیا گیا۔ یہ تخریبی عناصر نعرے بلند کر رہے تھے کہ "کون ہے جو اس صورت حال پر قابو پا سکتا ہے؟ مرکزی کمیٹی کا کوئی شخص یہ نہیں کر سکتا۔ اگر وہ آج یہاں آئے گا تو واپس نہیں جا سکے گا۔" ان کی اس لے لگام انقلاب دشمنی، اکڑفوں پر عوام کو شدید غصہ آیا۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا: "آزادی سے لے کر اب تک تین آن مین سکوئر ہمیشہ وہ جگہ رہی ہے جہاں ہمارے عظیم رہنما چیئرمین ماؤ نے انقلابی دستوں کا معائنہ کیا ہے۔ ہم اس جگہ ان انقلاب دشمن حرکتوں کو قطعاً برداشت نہیں کریں گے۔" غنڈوں نے مزدور ملیشیا کے ان سینکڑوں جوانوں کو جو پہرہ دیتے عظیم عوامی ہال کی طرف جانے والی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے، کئی ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ غنڈے مسلسل رجعت پسندانہ نعرے لگا رہے تھے اور ہجوم میں سے جو ان کی مخالفت کرتا اسے وحشیوں کی طرح پیٹتے۔ ایسے بہت سے افراد کو گھسیٹ کر یادگار کی طرف لایا گیا اور زبردستی گھٹنوں کے بل جھک کر اپنے "جرائم" کے اعتراف پر مجبور کیا گیا۔

گیارہ بج کر پانچ منٹ پر لوگ تین آن مین سکوئر کی مشرقی سمت میں واقع چینی تاریخ کے

عجائب گھر کی طرف بڑھے۔ عجائب گھر کے سامنے ایک خاتون کامریڈ نے ان کو روکنے کی کوشش کی۔ تو اس کے ساتھ بدتمیزی کی گئی اور مارا پیٹا گیا۔ اسی وقت خراب عناصر کے ایک گروہ نے سکوائر کے جنوب مشرقی کنارے پر گھنٹہ گھر کے ساتھ واقع عوامی فوج آزادی کی ایک بیرک کا محاصرہ کرلیا۔ دروازہ توڑ کر اندر گھس گئے اور عمارت پر قبضہ کر لیا۔ کچھ بدمعاش جن کے بال (CREW CUT) رہے تھے، باری باری لوگوں کو اکساتے رہے تھے اور ایک ٹرانزسٹر ریڈیو فون پر پوری قوت سے چیخ رہے تھے۔ بارہ بجے کے قریب کچھ بدمعاشوں نے ایک کمیٹی کے افتتاح کا اعلان کیا جس کا نام "وزیراعظم کی یاد منانے کے لئے دارالحکومت کے عوام کی کمیٹی" رکھا گیا۔ ایک بدمعاش کو جس نے عینک پہن رکھی تھی، یہ گستاخ اعلان کرنے کی جرأت ہوئی کہ پبلک سیکورٹی بیورو دس منٹ کے اندر اندر اپنا جواب پیش کرے۔ اس نے دھمکی دی کہ اگر ان کے مطالبات پورے نہ کئے گئے تو وہ محکمہ سیکورٹی کو تباہ و برباد کر دینگے۔

عوامی فوج آزادی کے سپاہی جو تیئن آن مین سکوائر میں پہرے پر تعینات تھے، ساڑھے بارہ بجے اپنے بیرک کی حفاظت کے لئے باقاعدہ منظم طور پر اس کی طرف بڑھے۔ ہنگامے میں مصروف بدمعاشوں نے یہ چیخ چیخ کر انہیں اکسانا چاہا کہ "عوامی فوج کو عوام کے ساتھ ہونا چاہیے" اور یہ کہ "دوسروں کے بہکائے ہوئے لوگ بے گناہ ہیں"۔ بعد میں انہوں نے ایک دشنگھائی گاڑی کو الٹ کر آگ لگا دی۔

آگ بجھانے والے عملے کے جو افراد اور عوامی فوج آزادی کے محافظ اسے بجھانے کے لئے آگے بڑھے، انہیں روک دیا گیا اور ایک فائر انجن کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا گیا۔ ان لوگوں نے کہا کہ "آگ بجھانا، عوامی تحریک کو کچلنے کے مترادف ہے"۔ فائر بریگیڈ کے کئی افراد کو مار مار کر لہولہان کر دیا گیا۔

۵م - ۱۲ پر عوامی پولیس کا ایک دستہ مدد کے لئے پہنچا، لیکن ان کو بھی طعنے دیئے گئے اور آگے بڑھنے سے روک دیا گیا۔ کئی پولیس والوں کی ٹوپیاں اچک کر ہوا میں اچھال دی گئیں۔ ان پر چاقو اور چھریاں پھینکیں گئیں۔ بعض کو پکڑ لیا گیا اور ان پر حملے کئے گئے۔

دوپہر کے دوران ان مٹھی بھر انقلاب دشمنوں کی تخریبی حرکتیں مزید جنونی شکل اختیار کر گئیں۔ ڈیوٹی پر حاضر مزدور ملیشیا کے جوانوں کے لئے سامان خورد و نوش لانے والی اور پبلک سیکورٹی کے محکمے کے استعمال کی چار گاڑیاں نذر آتش کر دی گئیں۔

تقریباً پانچ بجے بدمعاشوں کی یہ ٹولی دوبارہ بیرک میں گھس گئی۔ پہرے داروں کو زدوکوب کیا اور پکڑ کر لے جایا گیا۔ پہلی منزل کی کھڑکیاں، دروازے توڑ دیئے گئے اور کمرے کی تمام اشیا لوٹ لی گئیں۔ انقلاب دشمن عناصر کی اس ٹولی نے ریڈیو، رضائیاں، بستروں کی چادریں، کپڑے اور کتابیں، سب آگ میں پھینک دیں۔ پیکنگ کی مزدور ملیشیا کی درجنوں سائیکلیں توڑ پھوڑ کر

نذرِ آتش کر دی گئیں۔ اس انقلاب دشمن ہنگامہ اور شور و غوغا کے درمیان سے سیاہ دھواں آسمان کی طرف بلند ہو رہا تھا۔ بیرک کی کھڑکیوں کے تقریباً تمام شیشے توڑ دیئے گئے اور پھر خود بیرک کو آگ لگا دی گئی۔

کامریڈ وہ تیہ نے جو پیکنگ میونسپل انقلابی کمیٹی کے چیئرمین ہیں، ۵ اپریل کو ٹین آن مین سکوئر میں ایک نشری تقریر کی۔ اس کا مکمل متن حسب ذیل ہے:-

"کامریڈو! پچھلے کچھ دنوں میں، جب ہم اپنے عظیم رہنما چیئرمین ماؤ کی ان اہم ہدایات کا مطالعہ کر رہے تھے جن میں دائیں بازو کی ان منحرفانہ کوششوں پر جوابی حملے کیے گئے تھے جو صحیح فیصلوں کو بدلنے کے لئے ہو رہی ہیں، ہم انقلاب کو سمجھ رہے تھے اور پیداوار کو بڑھا رہے تھے کہ کچھ مٹھی بھر خراب عناصر نے اپنے درپردہ مقاصد کی تکمیل کے لئے چنگ منگ تہوار کے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جان بوجھ کر ایک سیاسی ہنگامہ کھڑا کیا۔ انہوں نے چیئرمین ماؤ اور پارٹی کی مرکزی کمیٹی کو نشانہ بنایا۔ ان لوگوں نے سرمایہ داری کی راہ پر چلنے والے، ضدی، تنگ سیاؤ پنگ کی ترمیم پسند (REVISIONIST) روش پر تنقید کرنے اور دائیں بازو کی منحرفانہ کوششوں کے خلاف چلنے والی جدوجہد کا عمومی رُخ بدلنے کی ناکام کوشش کی۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اس سیاسی ہنگامے کی رجعت پسندانہ حقیقت کو صاف دیکھ لیں اور ان عناصر کی سازشوں اور گٹھ جوڑ کو بے نقاب کر دیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی انقلابی چوکسی میں مزید اضافہ کریں اور دھوکہ کھانے سے بچیں۔

انقلابی عوام اور میونسپلٹی کے مستقل، آزمودہ کارکنوں کو چاہیئے کہ وہ طبقاتی جدوجہد کو کلیدی سمجھ لیں۔ فوراً عملی قدم اٹھائیں اور ٹھوس اقدامات کے ذریعے چیئرمین ماؤ، پارٹی کی مرکزی کمیٹی، چیئرمین ماؤ کی انقلابی پرولتاری روش اور ہمارے سوشلسٹ مادرِ وطن کے عظیم دارالحکومت کا دفاع کریں۔ انہیں چاہیئے کہ وہ انقلاب دشمن تخریبی سرگرمیوں پر بھرپور کاری ضربیں لگائیں۔ پرولتاری آمریت کو مزید مضبوط اور مستحکم کریں اور بہترین صورتِ حال اور ماحول پیدا کریں۔ آؤ، ہم چیئرمین ماؤ کی سربراہی میں قائم پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے گرد جمع ہو جائیں اور عظیم تر فتوحات حاصل کریں۔

آج کچھ تخریبی عناصر ٹین آن مین سکوئر میں توڑ پھوڑ کی کارروائیوں اور ہنگامے کرنے میں مصروف ہیں۔ وہ انقلاب دشمن تخریبی سرگرمیاں کر رہے ہیں۔ انقلابی عوام کو چاہیئے کہ وہ سکوئر کو فوری طور پر چھوڑ دیں اور ان کے ہاتھوں بے وقوف نہ بنیں۔"

سن ہوا
(چین کی سرکاری خبر رساں ایجنسی)

جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے، چین میں یہ ہنگامے کمیونسٹوں اور غیر کمیونسٹوں میں نہیں ہو رہے، خود کمیونسٹوں میں ہو رہے ہیں۔ پھر یہ انتشار ماؤ سے تنگ کی وفات کے بعد نہیں ہوا

ماؤزے تنگ کی زندگی میں اُس کے سامنے ہو رہا ہے اور سامنے بھی اس طرح کہ ان میں سے ایک پارٹی کی قیادت خود ماؤزے تنگ کر رہا ہے۔ اسی سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ماؤزے تنگ کی وفات کے بعد وہاں کیا ہوگا! یہ سب اس لئے کہ وہاں کی تبدیلی (جسے سطح بینوں نے انقلاب سمجھ لیا تھا) قرآن کے بیان کردہ اصولوں کے خلاف عمل میں آئی تھی۔ وہاں اقدارِ خداوندی کے مطابق تعلیم و تربیت سے قوم کے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی اور اس تبدیلی کا جذبۂ محرکہ ایک شخصیت کی پرستش تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت (زمانے کے تقاضوں سے) ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری کی بنیادیں متزلزل ہو چکی ہیں۔ لیکن ان کی جگہ صحیح انسانیت ساز انقلاب کی عمارت صرف قرآن کی متعین کردہ بنیادوں پر ہی استوار ہو سکتی ہے۔

(-)

(۲)

یہ سال، قائدِ اعظمؒ کا سال قرار دیا جا رہا ہے۔ اور اس سلسلے میں یہاں جو بحثیں چھڑی ہیں، اُن میں سرِ فہرست یہ عنوان ہے کہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ سیکولرازم کے حامی تھے! (یا للعجب) ہم اس سلسلے میں اتنا کچھ لکھ چکے ہیں کہ اُس کے دہرانے کی نہ گنجائش ہے نہ فرصت۔ البتہ ان بحثوں میں جو خلطِ مبحث پیدا کیا جا رہا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ کم از کم اُس کی وضاحت کر دی جائے۔ اس ضمن میں چند اصطلاحات استعمال کی جا رہی ہیں، جن کا متعین مفہوم پیش نہیں کیا جاتا اور اس وجہ سے کوئی بحث بھی کسی فیصلہ کن مرحلے تک نہیں پہنچ پاتی۔ ذیل میں ہم، ان اصطلاحات کا متعین مفہوم پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یا کم از کم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب طلوعِ اسلام میں یہ اصطلاحات پیش کی جاتی ہیں تو ان سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے۔

۱۔ اسلام:۔ اس سے مراد ہے وہ نظریۂ حیات یا نظامِ زندگی جس میں انسانی زندگی کے اہم مسائل کا فیصلہ اُن غیر متبدل، ابدی اصول و اقدار کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے کیا جاتا ہے جو وحیِ خداوندی کی رو سے بوساطت رسالتِ محمدیہ دنیا کو ملے اور جو اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ ان معاملات کے طے کرنے کی ذمہ داری اسلامی مملکت پر ہوگی نہ کہ کسی فرد یا گروہ پر۔

۲۔ سیکولرازم:۔ اُس نظریہ یا نظام کا نام ہے جس میں مندرجہ بالا اصول و اقدار سے انکار کیا جاتا ہے۔ اور مسائلِ حیات سے متعلق فیصلے انسانوں کے خود وضع کردہ قوانین کی رو سے کئے جاتے ہیں۔

۳۔ مذہب:۔ اُس نظریہ یا سسٹم کا نام ہے جس میں مسائلِ حیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک کا نام تمدنی مسائل (پبلک لاز) ہے اور دوسرے کو شخصی معاملات (پرسنل لاز) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ تمدنی مسائل کا فیصلہ مملکت، انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی رو سے کرتی ہے۔ اور شخصی معاملات کا فیصلہ مذہبی پیشوائیت کے وضع کردہ احکام کی رو سے ہوتا ہے۔

۴۔ تھیاکریسی:۔ وہ نظام جس میں جملہ امور کا فیصلہ مذہبی پیشوائیت کے ہاتھوں میں ہوتا ہے

(۵) (ATHEISM) :- الحاد، بے دینی، خدا کا انکار — اس کی دو قسمیں ہیں۔

ا۔ ایسے خدا کا اقرار جس کا تعلق صرف خارجی کائنات سے ہے، انسانی زندگی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ یہ فیصلے سیکولرازم کے مطابق طے پاتے ہیں۔

ب۔ سرے سے خدا کے وجود ہی سے انکار۔

یہ ہے ان اصطلاحات کا مختصر الفاظ میں مفہوم۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ ان میں سے ہر شق اسلام کی ضد اور اس کے خلاف ہے۔ ان میں سے کوئی شق بھی اسلام کے ساتھ (CO-EXIST) نہیں کر سکتی۔ آپ چند صفحات آگے چل کر پرویز صاحب کا ایک انقلاب آفریں خطاب دیکھیں گے۔ اس کا نقطہ ماسکہ یہ ہے کہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور اسلام کے نظام کے احیاء اور قیام کے لئے دیا تھا۔ لیکن یہاں اس وقت تین طبقے اس کی مخالفت میں مصروف عمل ہیں۔ (۱) ملاحدہ (ATHEISM) کے حامی — اشتراکی وغیرہ۔ (۲) مذہب کے حامی — علماء حضرات اور (۳) تھیاکریسی کے حامی۔ مودودی صاحب اور ان کی جماعت۔ ان کی تھیاکریسی بھی بدترین قسم کی ہے، کیونکہ یہ اس اقتدار میں دیگر علماء کو شریک نہیں کرنا چاہتی۔ بلکہ ایک فرد (مودودی صاحب) کو مختار کل قرار دیتی ہے۔ ان تصریحات سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ طلوع اسلام ان نظریات کی مخالفت کیوں کرتا ہے، یا یہ جملہ حضرات اس کی مخالفت پر کیوں اترے ہوتے ہیں۔ یہ (اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کی طرح) اسلام اور صرف اسلام کی دعوت پیش کرتا ہے جس کے لئے یہ مملکت وجود میں لائی گئی ہے۔

(۰)

محترم پرویز صاحب کا درس قرآن کریم

لاہور میں ہر اتوار ۹ بجے صبح (فون ۸۰۰۰۸) ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن)	لائل پور۔ ہر جمعہ ½۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) فون ۲۴۹۴۳ ۶۵ کوتوالی روڈ۔ حیات سرجری کلینک۔
ملتان ہر جمعہ بعد نماز مغرب (بذریعہ ٹیپ) دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون ۷۲۰۷۱)	کراچی۔ ہر اتوار ½۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزم طلوع اسلام، دارالقائد فون ۶۱۰۴۶۸ ۲۰-۱/۱، ناظم آباد ۳
سیالکوٹ۔ ہر اتوار ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) ارشد جمیل احمد، محلہ کشمیری۔ متصل جیمز اسٹیشنان۔ تحصیل سیالکوٹ	راولپنڈی ہر جمعہ - ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) جی - ۱۶۶ لیاقت روڈ

باسمہٖ تعالیٰ

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی

یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی؟

یومِ اقبال کی تقریب (منعقدہ اپریل ۱۹۷۶ء) پر

پرویز صاحب کا حقیقت کشا خطاب

شائع کردہ۔ ادارۂ طلوعِ اسلام گلبرگ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی

عزیزانِ گرامی قدر۔ سلام و رحمت

آپ نے جب سے ہوش سنبھالا ہے یہ آواز آپ کے کان میں مسلسل آتی رہی ہوگی کہ مسلمانوں میں اتحاد نہیں، اتفاق نہیں۔ ان میں انتشار ہے، تشتت ہے۔ یہ مختلف قوموں اور گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ مختلف مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں میں منقسم ہیں۔ اگر ان میں کہیں اتحاد پیدا ہو جائے تو یہ ساری دنیا پر چھا سکتے ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ سب پر غالب آسکتے ہیں۔ اس قسم کی آوازیں زمانہ حال ہی کی پیدا شدہ نہیں۔ یہ قصہ صدیوں پرانا ہے۔ ہمارے اختلافات اور تفرقات کی داستان ہزار بارہ سو سال سے مسلسل آگے بڑھتی چلی آرہی ہے۔ ان اختلافات کو مٹانے کی کوششیں بھی بہت ہوئیں ۔ دور کیوں جایئے۔ ابھی پچھلی صدی میں جمال الدین افغانیؒ جیسی شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ ساری عمر نعل بر آتش، اسی اتحاد کا درد اور تڑپ سینے میں لئے مسلمانوں کے مختلف ممالک میں بگولے کا سا رقص کرتے رہے مسلسل سفر کی مشقتیں اٹھائیں۔ کہیں قید و بند کی صعوبات برداشت کیں۔ کہا جاتا ہے کہ آخر میں انہیں زہر تک بھی دے دیا گیا۔ بہرحال وہ ساری عمر اسی جدوجہد میں مصروف اور اسی تگ و تاز میں سرگرداں رہے لیکن انہیں کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ مجھے اُن کی تحریک پان اسلامزم کے مالۂ و ماعلیہ سے بحث نہیں میرا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ ان کی عمر بھر کی جدوجہد بلانتیجہ ثابت ہوئی۔ بلکہ مسلمانوں کی مختلف مملکتوں کے اختلافات کم ہونے کی بجائے اور بڑھ گئے۔ ان کے بعد ہمارے دور میں حکیم الامت علامہ اقبالؒ بھی اسی درد کو دل میں لئے ہوئے اٹھے۔ انہوں نے بھی اپنی ساری عمر اسی آہ و فغاں میں بسر کر دی۔ آپ جوابِ شکوہ کو دیکھئے۔ وہ کس کرب و اذیت سے کہتے ہیں۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک — ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک

حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک — کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک؟

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں!

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

ان کے شکوہ کا جو جواب ندائے جہاں کی طرف سے ملا اُس میں اقبالؒ سے کہا گیا کہ تم نے مسلمانوں کی ذلت و پستی کی دردانگیز داستان بھی سنائی اور اس باب میں ہماری بے اعتنائی کا شکوہ بھی کیا لیکن ذرا سوچو تو سہی کہ:-

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود — ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود؟
وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود — یہ مسلماں ہیں! جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود
یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو!

یہاں تو انہوں نے مسلمانوں کی مختلف ذاتوں اور گوتوں کا ہی ذکر کیا ہے لیکن آگے چل کر انہوں نے اپنے اس پیغام کی آماجگاہ کو وسیع تر کرتے ہوئے دنیا بھر کے مسلم ممالک کو مخاطب کیا اور کہا:-

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے — نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا — ترک خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر

یہ کچھ انہوں نے خضرِ راہ میں کہا اور اس سے اگلے ہی سال اپنی مشہور نظم طلوعِ اسلام میں انہوں نے خون کے آنسوؤں کے ساتھ کہا کہ:-

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو — اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی — تو اے شرمندۂ ساحل! اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم! اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

میں نے حضرت علامہؒ کے یہ چند اشعار مثال کے طور پر پیشِ خدمت کئے ہیں، ورنہ ان کا سارا کلام اسی حقیقت کا ترجمان اور ان کا پیام اسی نصب العین کا داعی ہے۔ لیکن بصد حسرت یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی یہ آتش نوائی بھی کوئی مثبت نتیجہ پیدا نہ کر سکی۔ اور وہ یہ کہتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے کہ:-

دیا اقبالؒ نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مردِ تن آساں تھا، تن آسانوں کے کام آیا

سوال یہ ہے کہ جب اختلاف و افتراق کے نقصانات کا بھی سب کو احساس ہے اور مسلمانوں کی ستر اسی کروڑ آبادی میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ملے گا جو آپس کے اتحاد اور ائتلاف کی ضرورت اور اہمیت کا قائل نہ ہو، تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان میں یہ اتحاد پیدا نہیں ہوتا؟ اس ضمن میں دردمندانِ ملت کی تمام کوششیں کیوں بے نتیجہ رہتی ہیں؟

اس کی وجہ کیا ہے؟

یہ وہ سوال ہے جو ہر دلِ دردمند میں بار بار اٹھتا ہے اور پھر کوئی جواب نہ پا کر کاشانۂ قلب میں بصد حسرت و یاس واپس لوٹ جاتا ہے۔ اسی سوال کا جواب میرے آج کے خطاب کا مرکزی خیال ہے۔

آج جہاں ہر شخص مسلمانوں کے اختلافات کا شکوہ سنج اور ان کے افتراق کا نوحہ خواں ہے، وہاں ہر فرد اس حقیقت کا معترف بھی ہے کہ اسلام کے صدرِ اول میں امت میں کامل اتحاد ہی نہیں بلکہ وحدت بھی۔ مسلمانوں میں کسی قسم کا اختلاف اور افتراق نہیں تھا۔ اس اتحاد کے لئے اُن کے جسم ہی آپس میں ملے ہوئے نہیں تھے۔ بلکہ قرآنِ کریم کے الفاظ میں، ان کے دل بھی ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان میں ایسی وحدت کس طرح پیدا ہو گئی تھی۔ اور اس کے بعد وہ کون سا عنصر تھا جس کے نہ رہنے سے یہ وحدت اس طرح پارہ پارہ ہو گئی کہ وہ پھر دوبارہ آج تک پیدا نہ ہو سکی۔ اگر ہم اس کھوئی ہوئی حقیقت کو تلاش کر لیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے اپنے مرض مزمن کی صحیح تشخیص کر لی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ صحیح تشخیص کے بعد مرض کا علاج ممکن ہو جاتا ہے۔ آیئے ہم اس اصل و بنیاد کی تلاش کے لئے بقلبِ سلیم، تاریخ کی راہوں پر چودہ سو منازل پیچھے کی طرف لوٹیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام، مذہب نہیں دین تھا۔ مذہب میں مقصود ہر شخص کی انفرادی نجات ہوتا ہے جس کے لئے وہ انفرادی طور پر کچھ رسوم بجا لاتا اور مذہب کے بتلائے ہوئے نیک کام کرتا ہے۔ اس میں اجتماعیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں ہر شخص اپنے لئے طور پر ہر مقام پر اور ہر قسم کے حالات میں مذہب پر کاربند رہ سکتا ہے۔ اس کے برعکس، دین ایک اجتماعی نظام کا نام ہوتا ہے۔ اس اجتماعی نظام کو قائم کرنے کے لئے ایک امت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ افراد، جو دین کے نظریہ یا آئیڈیا لوجی کی صداقت کو بہ طیبِ خاطر تسلیم کرتے ہیں، وہ انفرادی زندگی بسر نہیں کرتے بلکہ اس امت کے اجزا بن جاتے ہیں۔ یہ جو آج کل آپ عام طور پر سنتے چلے آ رہے ہیں اور سنتے رہتے ہیں کہ اسلام میں قومیت کا مدار ایمان کا اشتراک ہے تو اس کے یہی معنی ہیں۔ اس پوری کی پوری امت کا نصب العین حیات بھی ایک ہوتا ہے اور اس کے حصول کے لئے راستہ بھی ایک۔ اسے وحدت فکر و عمل کہتے ہیں۔ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اسی معیار اور منہاج کے مطابق ایک امت کی تشکیل کی تھی۔ یہی وہ امت تھی جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے کہا تھا۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (2/143) اس آیہ جلیلہ میں تین اہم حقیقتوں کا بیان ہے۔

امت کی تشکیل

پہلی یہ کہ مسلمان مختلف افراد نہیں تھے بلکہ ایک امت تھے۔ دوسری حقیقت یہ کہ اس امت کا وجود خود اپنی منفعت ہی کے لئے نہیں تھا، اس کا فریضہ یہ تھا کہ یہ اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کرے۔ اسی اعتبار سے اسے امتِ وسطیٰ کہا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ امت دنیا کی ہر قوم کے لئے یکساں فاصلے پر ہو گی جس طرح دائرے کا مرکز اس کے محیط کے ہر نقطے سے یکساں فاصلے پر ہوتا ہے۔ اسی اعتبار سے دوسری جگہ کہا گیا کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (3/110)۔ "تم وہ بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود و منفعت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور تیسری حقیقت یہ کہ خود اس امت کی بھی

ایک مرکزیت ہوگی۔ وہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تھی۔ حضورؐ کا منصب یہ تھا کہ وہ اس امت کے اعمال کی نگرانی کریں۔ یہ تھا اس امت کا منہاج اور طریقِ کار۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سا نقطۂ اتصال تھا جس نے ان افراد کو ایک امتِ واحدہ کے قالب میں ڈھال دیا تھا۔ بنیانٌ مرصوص یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح۔ (۶۱/۴) قرآنِ کریم نے اس حقیقت کی ان الفاظ میں وضاحت کر دی کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ (۳/۱۰۳) یعنی ان کی وجہِ جامعیت "اعتصام بحبل اللہ" تھی۔ حبل اللہ کے لغوی معنی "اللہ کی رسی" کے ہیں اور اس سے مقصد خدا کی کتاب قرآن کریم ہے۔ حبل اللہ یا رسی کی تشبیہ سے بات بڑی واضح ہو جاتی ہے۔ بہارو (جھاڑو) کے سینکڑوں تنکے ایک تاگے یا رسی سے بندھے ہوتے ہیں۔ جو کام ان تنکوں کو باہمد گر پیوست رکھنے میں جھاڑو کی رسی کرتی ہے وہی کام مختلف افراد کو امتِ واحدہ بنانے کے لئے اللہ کی رسی یعنی اس کی کتاب سرانجام دیتی ہے۔ یعنی خدا کی کتاب وہ ضابطۂ حیات تھی جو ان مختلف افراد کی باہمد گر پیوستگی کا ذریعہ تھی۔ لیکن کتاب تو حروف اور الفاظ کا مجموعہ ہوتی ہے اور تجرد (ABSTRACT) الفاظ مختلف افراد کے لئے وجۂ جامعیت نہیں بن سکتے۔ اس کے لئے کسی محسوس اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے جو ان افراد کو یکجا رکھ سکے اور ان کے اختلافی معاملات میں حکم بن جائے۔ یہ محسوس اتھارٹی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تھی۔

رسول اللہ کا منصب

قرآن کریم نے افرادِ امت کے مومن ہونے کے لئے شرط ہی یہ بتائی تھی کہ وہ اس سنٹرل اتھارٹی کے فیصلوں کو بطیب خاطر قبول کریں۔ چنانچہ سورۃ النساء میں ہے۔ فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ (۴/۶۵) "تیرا رب اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک ان کی حالت یہ نہ ہو کہ یہ اپنے ہر اختلافی معاملے میں تجھے اپنا حکم تسلیم کریں اور اس کے بعد ان کی کیفیت یہ ہو کہ تیرے فیصلے کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ ہو۔ یہ اسے بہ طیب خاطر قبول کریں اور اس کے سامنے ... سرِ تسلیم خم کر دیں۔" افرادِ امت کے مومن ہونے کے لئے تو یہ شرط عاید کی گئی اور دوسری طرف خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ (۵/۴۸) "تم ان کے اختلافی معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو۔" دوسرے مقام پر اس حقیقت کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی۔ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْہِ مِنْ شَیْءٍ فَحُکْمُہٗٓ اِلَی اللّٰہِ (۴۲/۱۰) ـــ "تمہارے تمام اختلافی امور کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق ہونا چاہیئے۔" ان تصریحات کی روشنی میں اُس اجتماعی نظام کا پورا پورا نقشہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے جسے قائم کرنے کے لئے یہ امت وجود میں لائی گئی تھی اور جس سے خود اس امت کی وحدت قائم رہتی تھی۔ یعنی

(۱) ان افراد کے فکر و عمل کا مرکز قرآن مجید۔

(۷) لیکن قرآنِ مجید کی اطاعت انفرادی طور پر نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی اتھارٹی "رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی وساطت سے اجتماعی طور پر۔ اس اتھارٹی کے لئے جیتی جاگتی ہونے کی شرط نہایت اہم اور لاینفک ہے۔ یہی ہے وہ محور جس کے گرد اسلامی نظام گردش کرتا ہے۔ اور یہی ہے وہ نقطہ

زندہ اتھارٹی

ماسکہ جس سے امت کی وحدت قائم رہتی ہے۔ آپ قرآن کریم میں دیکھئے۔ اس میں اطاعت کے لئے وَاسْمَعُوْا بنیادی شرط ہے۔ یعنی احکام کا سننا، اور ان کی اطاعت کرنا۔ سورۃ تغابن میں ہے۔ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا (۶۴/۱۶) "احکام کو سنو اور ان کی اطاعت کرو۔" سورۃ انفال میں ہے۔ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ۔ (۸/۲۰) "اے جماعتِ مومنین۔ اے امتِ مسلمہ۔ تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی مت کرو۔ درآں حالیکہ تم اس کے احکام کو سن رہے ہو۔" اور مومنین کی طرف سے اس کا جواب آتا تھا۔ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (۲/۲۸۵) "ہم نے سنا اور ہم اس کی اطاعت کرتے ہیں۔" ان تصریحات سے واضح ہے کہ اطاعت کے لئے احکامات کا سننا بنیادی شرط ہے اور احکامات وہی سنے جا سکتے ہیں جو کسی زندہ اتھارٹی کی طرف سے دیئے جائیں۔ اس نقطہ کو عزیزانِ من! بڑی اچھی طرح سے ذہن نشین فرما لیجئے کہ یہی دین کی روح ہے۔ اطاعت کتابوں کی رو سے نہیں کی جا سکتی، زندہ اتھارٹی کی رُو سے کی جا سکتی ہے۔

اب آگے بڑھیئے۔

قرآنِ کریم میں قانون یا نظام کے الفاظ نہیں آئے کیونکہ یہ قرآن کریم کی اولین مخاطب قوم کے

اللہ اور رسول سے مراد

ہاں مروج نہیں تھے۔ اس نظام کو "اطاعتِ خدا اور رسول" کہہ کر پکارا گیا۔ یعنی خدا کی اطاعت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے۔ قرآنِ مجید میں "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول" کی جامع اصطلاح اسی مفہوم کی ادائیگی کے لئے آئی ہے۔ دورِ حاضرہ میں اسے اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کہہ کر پکارا جائے گا جو کتاب اللہ کی اطاعت کیلئے قائم کی گئی ہو۔ واضح رہے کہ یہ مفہوم نہ میرا ایجاد کردہ ہے نہ دورِ حاضرہ کا وضع کردہ۔ ہمارے متقدمین کی تفسیروں میں اس سے یہی مفہوم لیا گیا ہے۔ وہ اس سنٹرل اتھارٹی کے لئے عام طور پر امام کا لفظ استعمال کرتے ہیں کیونکہ نظام کا لفظ ابھی ان کے زمانے میں بھی رائج نہیں ہوا تھا۔ ہمارے زمانے میں یہ اصطلاح رائج ہو چکی ہے اور عصرِ حاضر کی تفاسیر میں یہ الفاظ ملتے ہیں۔ اس ضمن میں دو ایک مثالیں پیشِ خدمت ہیں۔ سورۃ الانفال کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے۔ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (۸/۱)۔ لفظی ترجمہ ان الفاظ کا یہ ہے۔ "اے رسول! لوگ تم سے مالِ غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو! کہ مالِ غنیمت دراصل اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔" اس کی تشریح کرتے ہوئے (مولانا) ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں۔

مالِ غنیمت جو لڑائی میں ہاتھ آئے وہ اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔ یعنی یہ بات نہیں ہونی چاہیئے کہ جو جس کے ہاتھ میں پڑ گیا وہ اسی کا ہو گیا۔ بلکہ سب کچھ امام کے سامنے پیش کرنا چاہیئے۔ وہ اسے جماعت میں تقسیم کرے گا۔

مولانا آزاد نے یہاں "اللہ اور رسول" کے لئے متقدمین کے اتباع میں' امام کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن اگلے ہی صفحے پر یہ کہہ کر اس کی وضاحت کر دی ہے کہ:۔

قرآنِ کریم نے حکم دیا ہے کہ مالِ غنیمت جو کچھ بھی ہاتھ آئے، حکومت (یعنی اسٹیٹ) کا ہے۔　　　(ترجمان القرآن۔ جلد دوم۔ صفحہ ۵۳-۵۲)

اب دوسری مثال لیجئے۔ سورۃ المائدہ میں ہے۔ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ..... (۵/۳۳)۔ ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اس آیت کا ترجمہ یہ دیا ہے:۔

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لئے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں..... (ان کی سزا یہ ہے کہ .....)

اس ترجمے پر وہ حسب ذیل حاشیہ لکھتے ہیں:۔

زمین سے مراد یہاں وہ ملک یا وہ علاقہ ہے جس میں امن و انتظام قائم کرنے کی ذمہ داری اسلامی حکومت نے لے رکھی ہو اور خدا اور رسول سے لڑنے کا مطلب اُس نظامِ صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو...... ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا....... دراصل خدا اور اس کے رسول کے خلاف جنگ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے تعزیراتِ ہند میں ہر اُس شخص کو جو ہندوستان کی برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرے' بادشاہ کے خلاف لڑائی" (WAGING WAR AGAINST THE KING) کا مجرم قرار دیا گیا ہے۔

(تفہیم القرآن۔ جلد اول۔ ایڈیشن سنہ ۱۹۵۱ء صفحہ ۴۶۵)

کے بعد مختلف سزاؤں کے سلسلہ میں مودودی صاحب نے حسب ذیل حاشیہ لکھا ہے:۔

یہ مختلف سزائیں بر سبیلِ اجمال بیان کر دی گئی ہیں تاکہ قاضی یا امام وقت اپنے اجتہاد سے ہر مجرم کو اُس کے جرم کی نوعیت کے مطابق سزا دے۔ اصل مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ کسی شخص کا اسلامی حکومت کے اندر رہتے ہوئے اسلامی نظام کو الٹنے کی کوشش کرنا بدترین جرم ہے۔　　　(ایضاً)

ان حوالوں سے آپ نے دیکھ لیا کہ یہ کہنا کہ "اللہ اور رسول" سے مراد اسلامی نظام یا اسلامی حکومت ہے ایجادِ بندہ نہیں۔ اور تو اور خود مودودی صاحب بھی اس سے یہی مراد لیتے ہیں۔ میں نے مودودی صاحب کا نام خاص طور پر اس لئے لیا ہے کہ یہ صاحب اور ان کی جماعت میرے خلاف سب سے بڑا الزام یہ عاید کرتی ہے کہ میں "اللہ اور رسول" سے مراد اسلامی نظام لیتا ہوں اور اسی بنا پر یہ حضرات میرے خلاف "منکرِ سنت" ہونے کا پراپیگنڈا کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کی غرض میں ذرا آگے چل کر عرض کرونگا۔

بہرحال بات یوں چلی آ رہی تھی کہ قرآن کریم کی رو سے دین سے مراد ایک اجتماعی نظام ہے، اور اللہ اور رسول کی اطاعت سے مقصود اس نظام کی اطاعت ہے۔ اور اس اطاعت کے لئے ایک زندہ اتھارٹی کی موجودگی لازمی ہے۔ اس نظام کی یہ سب سے پہلی سنٹرل اتھارٹی حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ نظام رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی تک قائم رہنا تھا یا اسے آگے بھی چلنا تھا؟ ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب کو آخری کتاب اور اسلام کو تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک کے لئے دین الحق قرار دیا تو اس سے واضح ہے کہ اس نظام کو حضورؐ کی زندگی تک محدود نہیں رہنا تھا، آگے بھی چلنا تھا۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی :-

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ
اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ
فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا۔ (۳/۱۴۴)

محمدؐ بجز ایں نیست کہ خدا کا ایک رسول ہے۔ اس سے پہلے کئی رسول دنیا میں آئے اور اپنے اپنے فرائض منصبی سر انجام دینے کے بعد رخصت ہو گئے۔ اگر یہ رسول بھی کل کو وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم یہ خیال کر کے کہ یہ نظام تو اس رسول کی زندگی تک محدود تھا، پھر اپنی سابقہ روش کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو ایسا کرے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔

اس سے واضح ہے کہ اس نظام کو رسول اللہ کے بعد ختم نہیں ہو جانا تھا۔ آگے بھی چلنا تھا۔ اس

خلافت علیٰ منہاجِ رسالت

نظام کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں (خلفاء) نے برقرار رکھنا تھا۔ اس میں خلیفۃ الرسول کی اطاعت نے رسول اللہ کی اطاعت کی جگہ لے لینی تھی۔ اور "اللہ اور رسول کی اطاعت" کی عملی شکل خلافت علےٰ منہاجِ رسالت کی اطاعت تھی۔ اس نکتہ کی وضاحت کے لئے حضورؐ نے فرمایا تھا :-

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَ سُنَّةِ الْخُلَفَآءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ۔

تم پر میرے طریقے اور میرے خلفائے راشدین، مہدیین کے طریقے کی پیروی
لازمی ہے۔

اس نظام کی بنیادی شرط امت کی وحدت تھی۔ یا یوں کہیے کہ اس نظام کا لازمی نتیجہ امت کی وحدت تھی۔ اگر امت میں تفرقہ پیدا ہو جائے تو یہ نظام باقی نہیں رہ سکتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس نظام کے باقی نہ رہنے سے امت کی وحدت ختم ہو جاتی تھی۔ یعنی پھر اسلام دین نہیں رہتا تھا مذہب بن جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے جو قرآن کریم نے امت مسلمہ کو بڑی شدت کے ساتھ تاکید کی کہ تم تفرقہ نہ پیدا کر لینا۔ سورۃ الروم میں ہے۔ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ (۳۰/۳۱-۳۲)۔ "اے امت واحدہ! ایسا نہ ہو کہ تم مشرکین میں سے ہو جاؤ۔ یعنی ان لوگوں میں سے جنہوں نے دین میں تفرقہ پیدا کر لیا، فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئے اور پھر ان کی حالت یہ ہو گئی کہ ہر فرقہ اس فریبِ نفس میں مبتلا ہو گیا کہ ہم حق پر ہیں"۔ یہاں دیکھیے! امت کی وحدت توڑنے کو شرک قرار دیا گیا ہے۔

تفرقہ شرک ہے

بات بالکل واضح ہے جب امت ایک اتھارٹی کے تابع رہے تو اس کی وحدت قائم رہتی ہے۔ تفرقہ کے معنی یہ ہیں کہ مختلف گروہ، مختلف اتھارٹیز کے تابع ہو جاتے ہیں۔ اسی کا نام شرک ہے۔ اس کی تفسیر میں دوسری جگہ کہا۔ وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِ (۶/۱۵۴)۔ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ یہ میرا راستہ ہے۔ اسی کو صراطِ مستقیم کہا جاتا ہے۔ تم سب نے اسی کا اتباع کرنا۔ اگر تم نے مختلف راستے اختیار کر لیے تو پھر خدا کی طرف لے جانے والا راستہ کسی کے سامنے بھی نہیں رہے گا۔ یعنی اس طرح دین، مذہب میں تبدیل ہو جائے گا اور مذہب میں خدا کی طرف لے جانے والا راستہ ہوتا ہی نہیں۔ دوسرے مقام پر نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا۔ إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶/۱۶۰)۔ جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کر دیں اور خود گروہ بن کر بیٹھ جائیں۔ اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں"۔ رسول تو اس نظام کی مرکزی اتھارٹی تھا جس کے فیصلوں کا اطلاق تمام امت پر یکساں ہوتا تھا۔ جن لوگوں نے کسی اور اتھارٹی کو تسلیم کر لیا وہ اگر اس نظام کے اندر رہے، تو ان کی حیثیت باغیوں کی ہوگی۔ اور اگر نظام سے باہر چلے گئے تو امت محمدیہ کے افراد نہ رہے۔ دونوں صورتوں میں رسول اللہ کے ساتھ کوئی تعلق نہ رہا۔ قرآنی آیات کے علاوہ اس ضمن میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی بہت سی احادیث بھی ہیں جن میں تصریحاً کہا گیا ہے کہ امت سے علیحدگی کے معنی دائرہ اسلام سے خارج ہو جانا ہے۔ مسند امام احمد بن حنبلؒ کی ایک روایت ہے جس کا تشریحی ترجمہ حسب ذیل ہے۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے۔ الجماعۃ۔ والسمع۔ والطاعۃ۔ والھجرۃ۔ والجہاد فی

جماعت کے ساتھ رہو)۔ (حکم امیر) سنو اور (اس کی) اطاعت کرو (ضرورت پڑے تو اپنی عزیز ترین چیزوں کو بھی) چھوڑ دو۔ (اسے ہجرت کہتے ہیں)۔ اور اللہ کے راستے میں جہاد کے لئے نکل کھڑے ہو۔ یاد رکھو! جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر بھی الگ ہو گیا، اسلام کا پٹہ اس کی گردن سے اتر گیا۔ عرض کیا کہ یا رسول اللہ! خواہ وہ روزے رکھتا ہو اور نمازیں پڑھتا ہو۔ (کیا پھر بھی اسلام سے خارج ہو جائے گا)؟ فرمایا۔ ہاں! خواہ وہ نمازیں پڑھتا ہو اور روزے رکھتا ہو اور بزعم خویش اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو (دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا)

امت کو اس قسم کی واضح تاکیدات کے بعد حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے اور آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفائے راشدینؓ نے اس نظام کو اسی طرح قائم رکھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ رسول اللہ خدا کے مامور تھے اور یہ خلفاء، قرآن کریم کے مشاورت کے حکم کی رو سے، امت کے منتخب کردہ۔ ختم نبوت کے ساتھ ماموریں من اللہ کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ مامور من اللہ صرف رسول ہوتا تھا۔ لہٰذا رسول اللہ کے بعد اسلامی نظام کی مرکزی اتھارٹی امت کا منتخب کردہ امام، یا خلیفہ ہوتا تھا۔ منصب اور فریضہ دونوں کا ایک تھا۔ یعنی دین کے نظام کا قیام جس میں قوانینِ خداوندی (قرآن مجید) کی اطاعت کرائی جائے۔ یہ نظام خلافت راشدہ تک قائم رہا۔ اس میں نہ کوئی مذہبی فرقہ پیدا ہوا نہ سیاسی پارٹی۔ ہر متنازعہ فیہ معاملہ کے لئے ایک سنٹرل اتھارٹی موجود تھی اور اس طرح امت کی وحدت قائم تھی۔ انتظامی مقاصد کے لئے یہ وسیع و عریض مملکت بے شک مختلف ولایتوں (صوبوں) میں منقسم تھی لیکن ان سب کی سنٹرل اتھارٹی ایک ہی تھی۔ اس قسم کے انتظام کا ذکر خود قرآن کریم نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ (۴/۵۹) "اے جماعت مومنین! تم اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور ان حاکموں کی جنہیں اسلامی نظام نے کچھ اختیارات سونپے ہوں" فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (۴/۵۹) "اگر تم میں اور ان حکام میں کسی معاملے میں اختلاف ہو جائے تو اس کے رفع کرنے کے لئے اللہ اور رسول یعنی اس نظام کی سنٹرل اتھارٹی کی طرف رجوع کرو۔ تم اس طریق پر قائم رہے تو سمجھا جائے گا کہ تم صاحب ایمان ہو۔"

بنی امیہ کے زمانے میں اس نظام کی کیا کیفیت تھی اس کے متعلق تاریخ سے کوئی واضح نقشہ ہمارے سامنے نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری تاریخ بالکلیہ قابلِ اعتماد نہیں — اسے مختلف زاویہ نگاہ سے مرتب کیا گیا ہے۔ بایں ہمہ اتنی بات واضح ہے کہ اس زمانے میں بھی کم از کم امت کی سیاسی وحدت قائم تھی۔ بنو عباس کے زمانے میں نہ مملکت کی سیاسی وحدت قائم رہی نہ دین کا وہ نقشہ برقرار۔ مسلمانوں کی الگ، الگ خود مختار سلطنتیں قائم ہوتی چلی گئیں۔ دوسری طرف سیکولر نظام

رائج ہوگیا جس کی وجہ سے سلطنت نے پبلک امور تو اپنے اقتدار میں رکھ لئے اور مذہبی امور علماء کی تفویض میں دیدیئے۔ اس طرح دین مذہب میں تبدیل ہوگیا۔ مختلف فرقے پیدا ہونے شروع ہوگئے۔ ان میں سے ہر فرقہ کی اتھارٹی الگ الگ تھی۔ چونکہ دین کی سنٹرل اتھارٹی باقی نہ رہی اسلئے "اطیعوا اللہ، و اطیعوا الرسول" کا صحیح مفہوم بھی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ اس کے معنی ہوگئے: اللہ کی اطاعت اور اللہ کے رسول کی اطاعت۔ اس سے یہ سوال ابھرا کہ اللہ کی اطاعت سے مراد تو اس کی کتاب کی اطاعت ہوتی۔ اس کے رسول کی اطاعت کس طرح کی جائے؟ اس مشکل کا حل یہ سوچا گیا کہ رسول کی اطاعت، حضورؐ کی طرف منسوب احادیث کی رُو سے کی جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے احادیث کے مختلف مجموعے مرتب کئے گئے۔ لیکن ان احادیث میں باہمدگر اختلاف تھا اسلئے ان کی رو سے اطاعت میں بھی اختلاف ہوگیا۔ مختلف فرقوں کا وجود اس اختلاف کا فطری نتیجہ تھا۔ امت کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی۔ آپ نے غور فرمایا کہ ایک سنٹرل اتھارٹی کے نہ رہنے سے کس طرح دین کا نظام بھی ختم ہوگیا اور امت کی وحدت بھی معدوم!

یہ ہے وہ کیفیت جو ہمارے ہاں صدیوں سے مسلسل چلی آرہی ہے۔ کروڑوں افراد پر مشتمل مسلمان افراد کا بے شک نام تو ایک ہے (یعنی مسلمان) لیکن اس نام کے سوا ان میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ مذہب میں ہوتا ہی یہی ہے۔ آپ عیسائیوں کے ہاں دیکھئے۔ دنیا میں ان کی آبادی مسلمانوں سے بھی زیادہ ہے لیکن ان میں اشتراک صرف نام کا ہے۔ عیسائیت کا مذہب ان کی وجہ جامعیت نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ عیسائی سلطنتیں باہمدگر مصروف جنگ و قتال رہتی ہیں۔ ہمارے زمانے میں پہلی اور دوسری عالمگیر جنگیں بنیادی طور پر عیسائی مملکتوں کے مابین ہی تھیں۔ ان عیسائیوں میں مشترک قدر اتنی ہی ہے کہ وہ اتوار کے دن گرجوں میں چلے جاتے ہیں یا کرسمس کے تیوہار کا جشن مسرت منا لیتے ہیں۔

ہماری حالت

بعینہٖ یہی حالت ہم مسلمانوں کی ہے۔ ہم سب اپنا نام مسلمان رکھتے اور اسلام اپنا مذہب لکھتے اور بتاتے ہیں۔ لیکن یہ مذہب مختلف مسلم سلطنتوں میں تو ایک طرف، ایک ہی مقام پر بسنے والے مسلم افراد میں بھی کسی قسم کی یگانگت کا موجب نہیں بنتا۔ (مثلاً) قرآن کریم نے کہا تھا وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا (4:93) "جس مسلمان نے کسی دوسرے مسلمان کو بالارادہ قتل کردیا تو وہ ابدی طور پر جہنم میں رہے گا۔ اس پر خدا کا غضب اور لعنت ہوگی۔ اور اس کے لئے عظیم عذاب تیار رکھا جائے گا"۔ یہ تھی قرآن کی رو سے مسلمان کے ہاتھوں کسی ایک مسلمان کے قتل کی پاداشن۔ اب صورت یہ ہے کہ انفرادی طور پر ہر روز مسلمان مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوتے ہیں اور اجتماعی طور پر مسلمان مملکتیں ایک دوسرے کے ساتھ مصروف جنگ و قتال رہتی ہیں۔ مذہب اسلام کا اشتراک انہیں اس سنگین جرم کے ارتکاب سے باز نہیں رکھتا۔ مختلف فرقوں کی یہ کیفیت ہے کہ ہر فرقے کی مسجد الگ الگ ہے اگرچہ ہر فرقہ اپنی

مسجد کا رُخ ایک ہی سمت (قبلہ) کی طرف رکھتا ہے، یا جماعت نماز ادا کرنے کو سمجھ لیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جماعت کے ساتھ رہنے کا جو تاکیدی حکم دیا تھا اس کی تعمیل ہو گئی۔ امام کی آواز پر رکوع و سجود کی ادائیگی سے اس خود فریبی میں مبتلا رہا جاتا ہے کہ "سمع و طاعت" کا جو حکم دیا گیا تھا اس کی پوری پوری تعمیل ہو رہی ہے۔ حج کے موقعہ پر لاکھوں کے میکانکی اجتماع کو اتحادِ اسلامی کا روح پرور نظارہ کہہ کر تکبیر کے نعرے بلند کئے جاتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر رابطۂ عالمِ اسلامی کی سی تحریکوں، اور سربراہانِ مملکتِ اسلامیہ کی کانفرنسوں سے یہ اطمینان حاصل کر لیا جاتا ہے کہ ہم وحدتِ امت کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ قرآنِ کریم نے ایک قسم کی اجتماعیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا کہ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ۔ (۵۹/۱۴) "تم انہیں یکجا دیکھ کر خیال کرو گے کہ یہ واقعی ایک جماعت ہے۔ لیکن ان کا یہ اتحاد محض ان کے جسموں کا یکجا ہونا ہے۔ ان کے دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔" دو سال اُدھر جو خود ہمارے ہاں مسلم سربراہوں کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس کے "اتحاد" کا بھانڈا ابھی حال ہی میں پھوٹا ہے۔ اس میں مصر کے صدر سادات اس اتحاد کی کوششوں میں پیش پیش نظر آتے تھے۔ وہ آگے بڑھ بڑھ کر ہر ایک سے گلے مل رہے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے مجیب الرحمٰن کو کانفرنس میں شریک کرنے اور بنگلہ دیش کو تسلیم کرانے کے لئے بھی نمایاں "خدمات" سرانجام دی تھیں۔ نظر آتا تھا کہ اس شخص کا سینہ دردِ ملت سے لبریز اور اس کا دل اتحادِ امت کے جذبہ سے سرشار ہے۔ اب حال ہی میں یہ بھید کھلا کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں روسی اسلحہ کے لدے ہوئے جہاز قاہرہ ایرپورٹ سے سیدھے بھارت بھیجے جاتے تھے تاکہ وہ ان کے ذریعہ بنگلہ دیش میں پاکستانی فوجوں کو شکست دے سکیں اور اسی سے یہ راز بھی کھلا کہ صدر سادات سربراہی کانفرنس کے اختتام پر یہاں سے سیدھے بھارت کیوں تشریف لے گئے تھے۔ سوال عزیزانِ من! کسی ایک مملکت یا کسی ایک سربراہ کا نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ "مذہب" مختلف افراد میں وجہِ اخوت اور مختلف مملکتوں میں باعثِ یگانگت بن سکتا ہے۔ یہ فریبِ نفس ہے۔ مذہب (خواہ کوئی بھی ہو) نہ کبھی وجہِ یگانگت بنا ہے نہ اب بن سکتا ہے۔ یہ صورت تو دین سے پیدا ہوتی ہے۔

اقبالؒ کا پیغام

اور یہ وہ پیغام تھا جسے اقبالؒ عمر بھر عام کرتا رہا۔ سب سے پہلے اس نے اس حقیقت کو واشگاف کیا کہ دین کی رو سے فرد کی ہستی ربطِ ملت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ یعنی وہی چیز جسے حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے تمسک بالجماعت کہہ کر پکارا تھا۔ اسرار و رموزؒ علامہ اقبالؒ کا سب سے پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ وہ اس میں لکھتے ہیں:-

فرد را ربطِ جماعت رحمت است — جوہرِ اُو را کمال از ملت است

فرد و قوم آئینہ یک دیگر اند — سلک و گوہر کہکشان و اختر اند

فرد می گیرد ز ملت احترام

ملت از افراد می یابد نظام

[illegible]

جاوید نامہ ان کے فلسفہ اور پیام پر مشتمل بڑی اہم کتاب ہے۔ وہ اُس میں ایک مقام پر اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ امت کی تشکیل کس طرح سے ہوتی ہے'... کہتے ہیں کہ:-

قوتِ دیں از مقامِ وحدت است　　　وحدت از مشہود گردد ملت است

یعنی افراد کی وحدت جب محسوس اور مشہود شکل اختیار کرے تو اُسے ملت یا جماعت یا امت کہا جاتا ہے۔ اور یہی وہ وحدت ہے جس سے دین کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

ارمغانِ حجاز اُن کا آخری مجموعۂ کلام ہے جو اُن کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ وہ اس میں اِس طرح متشکل شدہ امت کے متعلق کہتے ہیں کہ:-

میانِ امتاں والا مقام است　　　کہ آں امت دو گیتی را امام است
نیاساید ز کارِ آفرینش　　　کہ خواب و خستگی بر وے حرام است[1]

اسی سلسلہ میں آگے ایک قطعہ ہے جس کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ دین کا پورا نظام اور امت اور اُس کے نصب العین کا باہمی ربط اس کے اندر سمٹ کر آگیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس امت کی کیفیت یہ ہے۔

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ　　　نگاہِ اُو بہ شاخِ آشیانہ
مہ و انجم گرفتارِ کمندش　　　بدستِ اوست تقدیرِ زمانہ

پرندے دن بھر فضا کی پہنائیوں میں محوِ پرواز رہتے ہیں۔ وہ سینکڑوں میل تک دور دور نکل جاتے ہیں لیکن اپنے آشیانے کا تصور ایک ثانیہ کے لئے بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ اور وہ دن بھر کی تگ و تاز کے بعد شام کو پلٹ کر اُسی آشیانے میں آجاتے ہیں۔ امتِ مسلمہ کی بھی یہی کیفیت ہے۔ وہ رزمگاہِ حیات کے ہر گوشے میں مصروفِ تگ و تاز رہتی ہے۔ وہ زندگی کے ہر گوشے میں منہمکِ سعی و عمل رہتی ہے۔ لیکن اپنا نصب العینِ حیات اس کی نگاہوں سے کبھی اوجھل نہیں ہوتا۔ اور اسی وحدتِ نصب العین سے اُس میں ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ چاند اور ستاروں تک اس کی کمند میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اور اقوامِ عالم کی تقدیر اس کے ہاتھ میں۔

وحدتِ نصب العین کی اسی بنیادی حقیقت کو انہوں نے جاوید نامہ میں ان حسین و بلیغ الفاظ میں مرکوز کر دیا ہے کہ:-

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ؟　　　با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے، ہم رسمی طور پر امتِ محمدیہ اور ملتِ اسلامیہ جیسے الفاظ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اقبالؒ اُس ملت کو (یعنی ہم مسلمانوں کو) وہ ملت ہی نہیں قرار دیتا جسے قرآن کی روشنی میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے متشکل فرمایا تھا۔ وہ ارمغانِ حجاز میں لکھتے ہیں:-

---

[1] یعنی وہ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (۲۵۵/۲) کی خدائی صفت کی علیٰ حدِ بشریت مظہر ہوتی ہے۔

مسلماں فاقہ مست و ژندہ پوش است ز کارش جبرئیل اندر خروش است
بیا نقشِ دگر ملت بریزیم کہ ایں ملت جہاں را بار دوش است

اس نشاۃِ جدیدہ کی رُو سے متشکل ہونے والی ملت کے متعلق اگلے قطعہ میں ہے۔

دگر ملت کہ کارے پیش گیرد دگر ملت کہ نوش از نیش گیرد
نگردد با یکے عالم رضا مند دو عالم را بہ دوشِ خویش گیرد

اقبالؒ نازی ازم، فاشزم یا کیمونزم کی طرح فرد کو ملت میں گم کرکے اس کے جداگانہ تشخص کو مٹا نہیں دیتا۔ وہ افراد کا تشخص قائم رکھتا ہے اور اسی کو ملت کی قوت کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

بانگِ درا میں ہے:۔

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

(۰)

مرکزِ ملت

جماعت کی اہمیت کے بعد اقبالؒ دین کے نقطہ ماسک کی طرف آتا ہے۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ اسلامی نظام کی سنٹرل اتھارٹی اس وحدت کے قائم رکھنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اقبالؒ نے اسے مرکزِ ملت کہہ کر پکارتا ہے۔ یہاں اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ مرکزِ ملت سے مراد کوئی ایک فرد نہیں۔ اسلامی نظام میں سنٹرل اتھارٹی یا مرکزی حکومت کی جو شکل بھی قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے امت کے باہمی مشورہ سے متعین کرلی جائے گی، اسے مرکزِ ملت سے تعبیر کیا جائے گا۔ اس مرکزی اتھارٹی کے متعلق اقبالؒ نے اپنی مختلف کتابوں میں بڑی شرح و بسط سے لکھا ہے۔ وہ اسرار و رموز میں کہتے ہیں۔

قوم را ربط و نظام از مرکزے روزگارش را دوام از مرکزے
حلقہ را مرکز چو جاں در پیکر است خطِ او در نقطۂ او مضمر است

اس سلسلے میں وہ مسلمانوں کو یاد دلاتے ہیں کہ تم بنی اسرائیل کو دیکھو جب ان کی مرکزیت باقی نہ رہی تو ان کا سارا شیرازہ بکھر گیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

عبرتے اے مسلمِ روشن ضمیر از مآلِ امتِ موسیٰ بگیر
داد چوں آں قوم مرکز را ز دست رشتۂ جمعیتِ ملت شکست

وہ موجودہ مسلمانوں کی لامرکزیت پر خون کے آنسو بہاتے ہیں اور ان کے تمام امراض کی علت اسی کو قرار دیتے ہیں۔ ارمغانِ حجاز کے دو تین قطعات ملاحظہ فرمائیے۔ وہ کہتے ہیں۔

ہنوز ایں چرخِ نیلی کج خرام است ہنوز ایں کارواں دور از مقام است
ز کارِ بے نظامِ او چہ گویم تو می دانی کہ ملت بے امام است

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں:-

شبے پیشِ خدا بگریستم زار! مسلماناں چرا زارند و خوارند

ندا آمد! نمی دانی کہ ایں قوم دلے دارند و محبوبے ندارند

وہ لامرکز قوم کی تمام جدوجہد کو سعیٔ لاحاصل قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:-

ازاں فکرِ فلک پیما چہ حاصل کہ گردِ ثابت و سیارہ گردد

مثالِ پارۂ ابرے کہ از باد بہ پہنائے فضا آوارہ گردد

اسی کو وہ پرندے اور آشیانے کے غیر مرئی ربط کی تشبیہ سے زیادہ وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ اُن کے ایک قطعہ کا پہلا شعر میں پہلے پیش کر چکا ہوں۔ پورا قطعہ اب ملاحظہ فرمائیے۔

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ! با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

مردۂ! از یک نگاہی زندہ شو بگذر از بے مرکزی پایندہ شو

وہ ضربِ کلیم میں کہتے ہیں کہ:-

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے؟ خدائی!

(۰)

میں نے پہلے بتایا ہے کہ امتِ مسلمہ کا فکری، اعتقادی اور آئینی مرکز خدا کی کتاب' قرآن مجید ہے۔ اور ان کے عمل و کردار کا مرکز اسلامی نظام اور اس کی مرکزی اتھارٹی۔ لیکن محسوسات کا خوگر انسان کوئی محسوس مرکز بھی چاہتا ہے جو اس کے نصب العین کی علامت بن سکے۔ دورِ حاضرہ کی مثال میں یوں سمجھئے کہ جب ہم ماسکو کہتے ہیں تو اُس سے مراد ایک شہر نہیں ہوتا بلکہ کمیونزم کا محسوس مرکز یا علامت ہوتا ہے۔ دنیا میں کمیونسٹ کہیں بھی ہوں' ان کی فکر و نظر اس محسوس مرکز کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے اس تقاضا کا بھی احترام کیا اور ان کے لئے ایک محسوس مرکز متعین کر دیا۔

مرکزِ محسوس۔ قبلہ | یہ مرکز کوئی شہر نہیں بلکہ کعبہ ہے جسے خدا نے اپنا گھر کہہ کر پکارا ہے۔ تعمیرِ کعبہ کا مقصد ہی یہ تھا کہ یہ دنیا بھر کے توحید پرستوں کا محسوس مرکز بن سکے۔ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو اسلامی مملکت قائم کی، مدینہ اس کا دارالحکومت تھا۔ عام دنیاوی مملکتوں کے منہاج کے مطابق اسی شہر کو اس ملت کا مرکزِ محسوس قرار پانا چاہیئے تھا لیکن مدینہ تشریف رکھتے ہوئے بھی حضورؐ کے دل میں یہ مقدس آرزو مچلتی تھی کہ یہ مرکزِ محسوس کعبہ ہی ہونا چاہیئے، حالانکہ اس وقت کعبہ اسلام کے مخالفین کے قبضے میں تھا۔ قرآن کریم نے حضورؐ کی اس آرزو کو ان حسین الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا۔ (۲/۱۴۴) "ہم دیکھ رہے ہیں کہ تیری نگاہیں کس طرح بار بار آسمان کی طرف اٹھ رہی ہیں۔ تم اطمینان رکھو۔ ہم تمہارے پسندیدہ مرکز کو یقیناً تمہاری تولیت میں دے دیں گے۔" چنانچہ آخر الامر کعبہ کی تولیت اس نظام کی تحویل میں آگئی اور اسے امتِ مسلمہ کے لئے قبلہ قرار دے دیا

دیا گیا ـــ قبلہ کے معنے ہوتے ہیں وہ جو ہر وقت کسی کے پیشِ نظر رہے۔ اسی کو نصب العین کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس امت سے کہا گیا۔ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (2/144) "تم جہاں کہیں بھی ہو اپنی نگاہیں اسی مرکز کی طرف مرکوز رکھو۔" اس کے مفہوم کو اور وضاحت سے سمجھنے کے لئے اقبالؒ کے اُس شعر کو پھر سے سامنے لائیے جسے میں پہلے بھی پیش کر چکا ہوں کہ :-

پَرَد در وسعتِ گردوں یگانہ   نگاہِ او بشاخِ آشیانہ

اقبالؒ نے اسرار و رموز میں اس مرکز کی اہمیت ان الفاظ میں بیان کی ہے :-

قوم را ربط و نظام از مرکزے   روزگارش را دوام از مرکزے
راز دار و رازِ ما بیت الحرام   سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرام
تو ز پیوندِ حریمے زندۂ   تا طوافِ او کنی پائندۂ
در جہاں جانِ امم جمعیت است
در نگر، سرِ حرم جمعیت است

اور ارمغانِ حجاز میں قبلہ کی غایت اور امت کے ساتھ اس کے قلبی روابط کو ایسے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے کہ نگہِ بصیرت اس پر غور کرنے سے وجد میں آجاتی ہے۔ کہا :-

حرم جز قبلۂ قلب و نظر نیست   طوافِ او طوافِ بام و در نیست
میانِ ما و بیت اللہ رمزیست   کہ جبریلِ امیں را ہم خبر نیست

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے۔ آج دنیا کی مختلف مملکتوں کے اپنے اپنے محسوس مراکز ہیں ـــ ماسکو، پیکنگ، واشنگٹن وغیرہ۔ لیکن یہ انسانوں کے وضع کردہ نظاموں کے قومی مراکز ہیں۔ اس کے برعکس کعبہ نہ انسانوں کے وضع کردہ نظام کا نصب العین ہے اور نہ ہی (آجکل کی اصطلاح میں) کسی قوم کا مرکز۔ وہ ضابطۂ خداوندی کی اطاعت کا محسوس مرکز ہے جسے تمام نوعِ انسان کا مرکز بننے کے لئے تعمیر کیا گیا ہے۔ دنیا میں رائج سیکولر نظام اس قسم کے مرکز سے محروم ہے، اس لئے اس کی رو سے نوعِ انسان کی عالمگیر برادری متشکل نہیں ہو سکتی جو قرآن کی غایت الغایات ہے۔ اسی بنا پر اقبالؒ کہتا ہے کہ :-

عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے   حرم کا رازِ توحیدِ امم ہے
تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب   کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے

اقبالؒ کے زمانے میں "لیگ آف نیشنز" قائم ہوئی تھی جس کا ہیڈ کوارٹر جنیوا میں تھا۔ اس نظام اور قرآنی نظام کے فرق کو نمایاں کرنے کے لئے اقبالؒ نے کہا کہ :-

مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

ان تصریحات سے آپ نے سمجھ لیا ہو گا کہ قرآن کریم کی رو سے دین کا مفہوم کیا ہے؟ یعنی خدا کی کتاب کو ضابطۂ حیات تسلیم کرنے کی بنا پر امتِ واحدہ کی تشکیل اس امت کی ایک مملکت، اُس مملکت

کی ایک سنٹرل اتھارٹی — جسے اقبالؒ نے مرکزِ ملت کہہ کر پکارا ہے — اس پورے نظام کو قرآن کریم نے الاسلام کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان اجزاء میں سے کوئی ایک جزو بھی باقی یا اپنی اصلی شکل پر قائم نہ رہے تو اسلام، اسلام نہیں رہتا۔ اس آئینہ میں دیکھئے تو قرآنی اسلام دنیا میں کہیں بھی موجود نہیں۔ اسلام، مذہب ہی کی شکل میں موجود ہے۔ اس حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے بڑی شدت سے محسوس کیا جس کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ جب تک اسلام کا نظام قائم نہیں ہوتا، امت میں وحدت پیدا نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد اتنا عظیم اور وسیع تھا کہ وہ بحالاتِ موجودہ ایک ہی جست میں حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس منزل تک بتدریج ہی پہنچا جا سکتا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ اس پروگرام کی ابتداء کسی ایک خطۂ زمین سے کی جائے۔ انہوں نے، علامہ جمال الدین افغانی کے ناکام تجربہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس وقت مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی قومی مملکتیں قائم ہیں اور کوئی مملکت بھی اپنے اس جداگانہ تشخص کو ملت کی وحدت میں گم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ انہوں نے یہ سوچا کہ اس پروگرام کا آغاز کسی ایسے خطۂ زمین سے ہو سکتا ہے جہاں پہلے سے کوئی مملکت قائم نہ ہو۔ اس کے لئے انہوں نے مملکتِ پاکستان کا تصور دیا اور اس تصور کو قائداعظمؒ کی مجاہدانہ

مملکتِ پاکستان

تگ و تاز نے ایک محسوس مملکت کی شکل میں منتشکل کر دیا۔ یہ ایک ایسا عظیم انقلاب تھا جس کی مثال ہماری تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اس سے پھر اُسی دین کے احیاء کے امکانات تابندہ اور روشن ہو گئے جسے صدرِ اول میں محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں نے قائم کیا تھا۔ اس سے آپ اس خطۂ زمین کی اہمیت کا اندازہ لگا لیجئے۔

لیکن وائے برحالِ ما! کہ اقبالؒ کا یہ خواب، خوابِ پریشاں ہو کر رہ گیا۔ پاکستان مسلمانوں کی ایک جداگانہ مملکت ہی بن سکا، اور اس میں اسلام، مذہب کی حیثیت ہی سے رائج رہا۔ یہ دین کے نظام کی جولانگاہ نہ بن سکا۔ اس کی وجوہات متعدد قرار دی جا سکتی ہیں لیکن میرے نزدیک اس کی بنیادی وجہ اور اساسی سبب ایک ہی ہے — اور وہ ہے اس بدنصیب ملک میں جماعتِ اسلامی کا وجود۔ مجھے اس کا اچھی طرح سے احساس ہے کہ میرے اس کہنے پر بہت سی بھویں تنیں گی، بہت سی پیشانیوں پر بل پڑیں گے۔ بہت سے چہرے خشمگین اور بہت سے دہن کف آگیں ہوں گے، میرے خلاف پروپیگنڈے کے سمندر میں ایک نیا تلاطم برپا ہوگا۔ لیکن عزیزانِ من! میں جس بات کو

جماعتِ اسلامی

حقیقت اور صداقت سمجھتا ہوں، مخالفتوں کا ہجوم مجھے اس کے اظہار و اعلان سے باز نہیں رکھ سکتا۔ میں پچیس سال سے ان کے اس پروپیگنڈے کا ہدف بنا چلا آرہا ہوں۔ میں جب اس طویل ... ے میں اس حقیقت کے اظہار سے رُک نہیں سکا تو اب، عمر کے اس آخری حصے میں، جبکہ ... جانتا ہوں کہ خدا کی بازپرس کا دن قریب آ رہا ہے، میں اظہارِ صداقت سے کیوں باز رہوں۔ ... شکل یہ ہے کہ ہماری قوم بڑی جذباتی واقع ہوئی

ہے۔ اس لئے وہ کسی تحریک پر اُس کے آغاز میں ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی عادی نہیں رہی۔ اس کی یہی جذباتیت تھی جس سے تحریکِ احمدیت اس طرح بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی۔ مرزا غلام احمد نے اپنا تعارف ایک مناظر کی حیثیت سے کرایا اور بظاہر اسی مقصد کے لئے اپنی پہلی کتاب "براہینِ احمدیہ" شائع کی۔ قوم نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور اس کی مدح و ستائش میں غلغلے بلند کر دیئے۔ اس نے بنظرِ غائر یہ دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ اُس تحریک کا رُخ کس منزل کی طرف ہے حالانکہ مرزا صاحب نے بعد میں خود اس امر کا اظہار کیا کہ اُس کتاب میں ان کے بعد کے دعاوی بین السطور چھپے ہوئے تھے اور یہ کہ انہوں نے یہ انداز اُس لئے اختیار کیا تھا کہ یہاں کے علماء اس "پیچ" میں پھنس جائیں۔ (بحوالہ اربعین نمبر ۲۔ صفحہ ۲۱) مسلمانوں کو اس کا احساس اس وقت ہوا جب وہ تحریک اپنے برگ و بار لا چکی تھی۔ اس قوم (بالخصوص پنجابی مسلمانوں) کی یہی وہ جذباتیت اور عجلت پسندی ہے جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ:۔

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت　　کرلے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد
تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا　　ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد
تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے
یہ شاخِ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

مودودی صاحب جب حیدر آباد (دکن) سے پنجاب آتے ہیں تو انہوں نے پنجابی مسلمان کی اس طبیعت کا خوب اندازہ لگایا۔ میرے ان کے ساتھ اس سے بہت پہلے سے مراسم تھے۔ لیکن اُس وقت تک میرا اُن سے تعارف صرف ان کی تحریروں کے ذریعے تھا۔ (میرے مضامین بھی ان کے رسالہ ترجمان القرآن میں چھپا کرتے تھے) میں یہاں اتنا واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اس قسم کی بحثوں میں، ذاتیات کو درمیان میں نہیں لایا کرتا۔ لہٰذا اس مقام پر بھی صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ حیدر آباد سے پنجاب جاتے وقت وہ اپنے مسکن دہلی میں کچھ دنوں کے لئے ٹھہرے تو ان کی اکثر نشستیں میرے مکان (واقعہ نئی دہلی) پر ہوتی رہیں۔ اُس وقت مجھے انہیں قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا تو میں نے ان کی طبیعت میں اس قسم کے جراثیم محسوس کئے اور دبی زبان سے انہیں اس سے متنبہ بھی کیا۔ اُس وقت تک وہ ماڈرن ٹائپ کے نوجوان صحافی تھے۔ دارالاسلام جا کر انہوں نے مذہبی لبادہ اوڑھا۔ اور اس کے بعد پنجاب کے مرکزی مقام لاہور میں اپنی علیحدہ جماعت کی بنیاد رکھی۔ ان کی جماعت کے پہلے اجتماع کی روئیداد ان کے رسالہ —— ترجمان القرآن کی جون جولائی اگست ۱۹۴۱ء کی مشترکہ اشاعت میں درج ہے، اور ہر صاحبِ بصیرت کو آج بھی دعوتِ غور و فکر دیتی ہے۔ اس اجتماع کی افتتاحی تقریر میں مودودی صاحب نے اس کی اہمیت کے سلسلے میں فرمایا کہ:۔

> اسلام بغیر جماعت کے نہیں ہے اور جماعت بغیر امارت کے نہیں۔ اس قاعدہ کلیہ کے مطابق ضروری ہے کہ جماعت بننے کے ساتھ ہی آپ اپنے

لئے ایک امیر منتخب کرلیں۔ (ترجمان القرآن مئی ۴۲ء)

جب حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم (یا بعض روایات کی رو سے حضرت عمرؓ) نے فرمایا تھا کہ "جماعت کے بغیر اسلام نہیں" تو ظاہر ہے کہ جماعت سے مراد امت واحدہ تھی۔ لیکن مودودی صاحب اس امت کے اندر اپنی جماعت کی تشکیل کرتے ہیں۔ اور اس کی سند میں یہ ارشاد نبویؐ (یا فاروقیؓ) پیش کرتے ہیں۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ مودودی صاحب نے فرمایا کہ اس جماعت کے بغیر، جو اب تشکیل کی جا رہی ہے، اسلام نہیں ہے۔ اسی لئے انہوں نے اس کا نام اسلامی جماعت رکھا۔ اب رہی اس کے امیر کی پوزیشن، سو انہوں نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:۔

> اسلامی نقطۂ نظر سے اقامت دین کی سعی کرنے والی جماعت میں، جماعت کے اولی الامر کی اطاعت فی المعروف دراصل اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کا ایک جزو ہے۔ جو شخص اللہ کا کام سمجھ کر یہ کام کر رہا ہے اور اللہ ہی کے کام کی خاطر جس نے کسی کو امیر مانا ہے وہ اس کے جائز احکام کی اطاعت کرکے دراصل اس کی نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے۔
>
> (ہدایات نمبر ۳)

مودودی صاحب کا مقام

آپ غور کیجئے کہ یہ دعاوی کس قدر خطرناک مستقبل کا پیش خیمہ تھے اسلامی جماعت وہ جماعت جس کے بغیر اسلام نہیں اور اس کے امیر کی اطاعت "خدا اور اس کے رسول کی اطاعت" کے مرادف۔ یا للعجب!

رسول کی اطاعت کے سلسلے میں مودودی صاحب نے کہا کہ یہ اطاعت احادیث کی رو سے کی جا سکتی ہے لیکن انہی احادیث کی رو سے، جسے "مزاج شناس رسول" صحیح احادیث قرار دیدے۔ اس جماعت کے نزدیک "مزاج شناس رسول" خود مودودی صاحب ہیں۔ احادیث کے متعلق بعینہٖ یہی مسلک مرزا غلام احمد ..... کا تھا۔ انہوں نے اس ضمن میں کہا تھا کہ:۔

> جو شخص حکم ہو کر آیا ہے اس کو اختیار ہے کہ حدیثوں کے ذخیرے میں جس انبار کو چاہے خدا سے علم پاکر قبول کرے اور جس ڈھیر کو چاہے، خدا سے علم پاکر رد کردے۔
>
> (تحفۂ گولڑویہ۔ صفحہ ۱۰)

"مزاج شناس رسول" کے ساتھ ہی اس جماعت نے مودودی صاحب کے متعلق یہ عقیدہ عام کیا کہ

> مودودی صاحب کی شخصیت امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے سلسلے کی ایک کڑی ہے
>
> (ماہنامہ فاران۔ بابت جون ۱۹۵۳ء)

اس جماعت کے موجودہ امیر میاں طفیل محمد صاحب نے اس تمام تفصیل کو چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا۔ جب کہا کہ:۔

> مولانا مودودی اس زمانے میں اسلام کی ایک مانی ہوئی ہستی تھے اور اسلام کے

ہر مسئلہ میں سند تھے اور سند ہیں۔

(جریدہ قاصد کشمیر نمبر۔ بحوالہ ماہنامہ الفرقان۔ مئی جون ۱۹۵۵ء صفحہ ۹۱)

مودودی صاحب نے جس زمانے میں اپنی جماعت کی تشکیل کی ہے، انہی دنوں انہوں نے ترجمان القرآن (بابت دسمبر ۱۹۴۰ء و جنوری ۱۹۴۱ء) میں ایک مبسوط مقالہ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا۔ تجدید و احیائے دین ۔۔ جسے بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا گیا تھا۔ اس میں انہوں نے "مجددین دین" میں سے ایک ایک کا نام لے کر یہ بتایا کہ یہ حضرات اپنے مشن میں کس طرح ناکام رہ گئے۔ اس کے بعد انہوں نے قوم سے کہا کہ اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ ایک آنے والا آئے گا۔ اور جو کچھ ان اسلاف میں سے کسی سے نہیں ہو سکا وہ کچھ کر کے دکھائے گا۔ انہوں نے اس میں لکھا ہے کہ:-

مقامِ مہدویّت

میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والا اپنے زمانے میں بالکل جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا۔ وقت کے تمام علوم جدیدہ پر اس کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگی۔ زندگی کے سارے مسائل کو خوب سمجھتا ہوگا۔ عقلی و ذہنی سیاست، سیاسی تدبّر، جنگی مہارت کے اعتبار سے وہ تمام دنیا پر اپنا سکہ جما دے گا۔ اور اپنے عہد کے تمام جدیدوں سے بڑھ کر جدید تر ہوگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی جدتوں کے خلاف مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے شورش برپا کریں گے۔ پھر مجھے یہ بھی امید نہیں کہ اپنی جسمانی ساخت میں وہ عام انسانوں سے کچھ بہت مختلف ہوگا۔ اس کی علامتوں سے اس کو تاڑ لیا جائے گا۔۔۔۔۔۔ وہ خالص اسلام کی بنیادوں پر ایک نیا مذہب فکر پیدا کرے گا۔ ذہنیتوں کو بدلے گا اور ایک زبردست تحریک اٹھائے گا۔ جو بیک وقت تہذیبی بھی ہوگی اور سیاسی بھی۔ جاہلیت اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اس کو کچلنے کی کوشش کرے گی۔ مگر بالآخر وہ جاہلی اقتدار کو الٹ کر پھینک دے گا اور ایک ایسا زبردست اسلامی اسٹیٹ قائم کرے گا جس میں ایک طرف اسلام کی پوری روح کارفرما ہوگی اور دوسری طرف سائنٹیفک ترقی اوج کمال تک پہنچ جائے گی۔

(ترجمان القرآن۔ صفحات ۵۴-۵۵)

آپ نے دیکھا کہ مودودی صاحب کس طرح قدم بقدم میرزا غلام احمد کے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن ان دونوں میں ایک بین فرق ہے۔ میرزا صاحب نے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی خواہش نہیں کی تھی۔ لیکن مودودی صاحب کا مطمحِ نگاہ، حکمرانی کا اقتدار حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ وہ اسلام کے صدرِ اول کی مثال پیش کرنے کے بعد، "صالحین" سے کہتے ہیں کہ:-

تم روئے زمین پر خدا کے سب سے زیادہ صالح بندے ہو۔ لہٰذا، آگے بڑھو۔

لڑکر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل کر دو۔ اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو۔ (خطبات۔ صفحات ۲۳۱، ۲۳۳، ۲۳۵)

ان حضرات کے یہی عزائم تھے جن کے پیش نظر قائداعظم، تحریک پاکستان کے دوران اس کی وضاحت کرتے رہے کہ پاکستان میں تھیاکریسی قائم نہیں ہونے دی جائے گی۔ اور یہاں پہنچ کر بھی انہوں نے واشگاف الفاظ میں اعلان کر دیا کہ:-

کچھ بھی ہو، یہ مسلّمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہو گی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن پورا کریں۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل۔ ص ۶۵)

اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ مودودی صاحب، قائداعظم کے اس قدر مخالف کیوں تھے اور ان کے متعلق اس قسم کا پروپیگنڈہ کیوں کیا کرتے تھے کہ ان کی فکر و کردار میں اسلام کی ایک چھینٹ تک بھی نہیں۔ مودودی صاحب، خدا اور رسول کے نام پر اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے تھے اور قائداعظم اسے بدترین قسم کی آمریت تصور کرتے تھے۔

بہرحال، میں کہہ یہ رہا تھا کہ مودودی صاحب، مہدویت کے مقام تک پہنچنے کے لئے کس طرح زمین ہموار کرتے جا رہے تھے۔ اصل یہ ہے کہ انہوں نے اس مقام کے لئے بہت پہلے سے ڈول رکھ دیا تھا۔ مرزا غلام احمد صاحب نے اپنی خلافت کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لئے.....

اپنی پیدائش کے متعلق

پیشگوئی کی تھی کہ تین سال کے بعد میرے ہاں ایک بیٹا پیدا ہو گا جو اسلام کے استحکام اور فروغ کا باعث بنے گا۔ مودودی صاحب نے بھی اپنی پیدائش کے سلسلے میں کہا ہے۔

میں ۳ رجب ۱۳۲۱ھ (۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء) کو اورنگ آباد میں پیدا ہوا۔ میری پیدائش سے تین سال پہلے ایک بزرگ والد مرحوم کے پاس آتے تھے۔ انہوں نے میری پیدائش کی پیشگوئی کی تھی اور والد صاحب سے فرمایا تھا کہ اس کا نام ابوالاعلیٰ رکھنا۔

(کتاب تصوف اور تعمیر سیرت صفحہ ۱۵۔ مرتبہ عاصم نعمانی شائع کردہ۔ اسلامک پبلیکیشنز۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

مودودی صاحب انہی عزائم کو لے کر پاکستان میں آئے تھے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جب انہوں نے ۱۹۵۳ء کے ختم نبوت کے سلسلے کے ہنگاموں میں دیکھا کہ اس قسم کے کھلے ہوئے دعاوی کے خلاف مسلمانوں کا آخرالامر ردِ عمل کیا ہوتا ہے تو انہوں نے اس کے متعین اعلان سے اپنے آپ کو روک لیا۔ لیکن اپنی کوششوں کو بدستور جاری رکھا۔ انہوں نے اس کی گنجائش بھی پہلے سے رکھ

لی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ آنے والا مہدی خود اس کا اعلان نہیں کریگا۔ لیکن :-

> اس کی موت کے بعد اُس کے کارناموں سے دنیا کو معلوم ہوگا کہ یہی تھا وہ خلافت
> کو منہاج النبوت پر قائم کرنے والا جس کی آمد کا مژدہ سنایا گیا تھا۔
> (ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۴۰ء و جنوری ۱۹۴۱ء۔ صفحہ ۴۴،۵۴)

ظاہر ہے کہ یہ تدبیر اپنی جماعت کے دل میں شمع امید کو روشن رکھنے کے لئے بڑی کارگر ہے۔ اور اب جو کہا جاتا ہے کہ مودودی صاحب کی روزمرہ کی زندگی کی جزئیات تک کا تصویری سوانح تیار کیا جا رہا ہے وہ غالباً اسی موعودہ ظہور کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ (ہفت روزہ سنگرام لاہور۔ بابت ۷ تا ۱۴ فروری ۱۹۷۶ء۔ صفحہ ۱۳)

یہ تھے عزیزانِ من! وہ عزائم جنہیں لے کر مودودی صاحب پاکستان تشریف لائے۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے، یہاں کے سادہ لوح مسلمان نے اسے قطعاً نہیں پہچانا، اور تحریک احمدیت کے ابتدائی دور کی طرح اس تحریک کو بھی اسلامی نظام کے قیام اور دین کے احیاء کا ذریعہ سمجھتا چلا آ رہا ہے۔ جیسا کہ میں ... کہہ چکا ہوں، میں نے ان جرائیم کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا اور یہی وجہ ہے جو میں اس جماعت کے یوم تاسیس کے وقت سے بالعموم اور قیام پاکستان کے بعد بالخصوص اس کی التزاماً مخالفت کرتا چلا آ رہا ہوں۔ (میں نے تحریک احمدیت کی بھی بہت پہلے سے مخالفت شروع کی تھی۔ چنانچہ جب ۱۹۳۵ء میں بہاولپور کے مشہور مقدمہ کے فیصلے میں "احمدیوں" کو خارج از اسلام قرار دیا گیا تھا تو اس کی بنیاد میرے ہی ایک مقالہ پر تھی)۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس جماعت نے، اور سب کو چھوڑ کر مجھے اپنے پروپیگنڈے کا ہدف بنا رکھا ہے۔ اس سلسلے میں یہ کہیں مجھے منکرِ حدیث قرار دیتے ہیں کہیں منکر اتباعِ سنت! اور چونکہ اپنی مصلحتوں کے لئے جھوٹ بولنا ان کے نزدیک شرعاً واجب ہوتا ہے۔ اس لئے وہ میرے خلاف اس قسم کے افترا باندھنے میں کوئی باک نہیں سمجھتے، بلکہ اسے کارِ ثواب خیال کرتے ہیں۔

مودودی صاحب اپنے ان عزائم میں اس قدر آگے بڑھتے گئے کہ خود ان کی جماعت کے بعض سربرآوردہ حضرات نے بھی انہیں بھانپ لیا اور انہیں اس پر متنبہ کیا۔ لیکن جب وہ اس پر بھی اپنی روش سے باز نہ آئے تو ان حضرات نے ان کی جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ان علیحدگی اختیار کرنے والوں میں (مولانا) امین احسن اصلاحی کا نام سرِفہرست تھا۔ جماعتِ اسلامی میں مولانا صاحب کا مقام مودودی صاحب سے دوسرے درجہ پر تھا۔ وہ ان کی عدم موجودگی میں، جماعت کے امیر مقرر ہوتے تھے۔ ان کے علم و فضل کا تعارف ان الفاظ میں کرایا جاتا تھا:-

> عالم، بلند نظر اور متبحر عالم، جس کی نگاہ خاک کے ذروں کا بھی جائزہ لیتی ہے،
> اور مہر و انجم کی گذرگاہوں کا بھی پتہ کرتی ہے۔ دس بیس نہیں، ہزاروں راتیں
> صرف قرآن کریم کے مطالعہ میں بسر کی ہیں۔ جن کی ذات قرآنی علوم کے لئے

قابلِ وثوق سند ہے۔ قرآن کا مفسر اور حدیث و فقہ میں جس کی ژرف نگاہی مسلّم۔
(ماہنامہ فاران۔ بابت جون ۱۹۵۳ء)

انہی اصلاحی صاحب نے جماعت سے علیحدہ ہونے کے وقت، مودودی صاحب کو ایک خط لکھا جس میں تحریر فرمایا کہ:-

آپ اپنے آپ کو نہ صرف جماعت اسلامی کا قائم مقام سمجھتے ہیں بلکہ خود اسلام کا بھی قائم مقام سمجھنے لگے ہیں۔ آپ کے نزدیک اگر آپ کی کسی حرکت پر کسی کو اعتراض ہو تو وہ جماعت پر اعتراض ہے۔ اور جب یہ جماعت پر اعتراض ہے تو اسلام پر اعتراض ہے۔ اسی طرح آپ اپنا یہ ذہن بنا بیٹھے ہیں کہ آپ کی ذات اگر کبھی زیرِ بحث آتی ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس ملک میں اقامتِ دین کا سارا کام درہم برہم ہو جائے گا اور لادینی طاقتیں غالب ہو جائیں گی۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ سوچنے کے اس انداز کو بدلیں۔ خدا نے اسلام کو نہ آپ کے ساتھ باندھا ہے نہ جماعتِ اسلامی کے ساتھ اور نہ کسی اور کے ساتھ۔ اگر آپ اسلام کا کام کرنے اٹھے ہیں تو خدارا اس کی یہ قیمت نہ مانگیے کہ اگر آپ اسلام پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگ جائیں تو بھی لوگ اس کو جاننے کے باوجود چپ رہیں، کیونکہ اس سے اقامتِ دین کے جہاد کو نقصان پہنچ جائے گا۔"

لیکن مودودی صاحب اب (روپے کے بل بوتے پر) ایسی پوزیشن حاصل کر چکے تھے کہ ان حضرات کی جماعت سے علیحدگی انہیں کچھ نقصان نہ پہنچا سکی۔ اور وہ اپنے عزائم میں آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔

(۲)

علامہ اقبالؒ نے اسلامی نظام اور اس میں مرکزِ ملت کا تصور شعر کی زبان میں پیش کیا تھا، جو بہرحال اشاراتی اور تلمیحاتی ہوتی ہے۔ میں نے ان اشارات کی تفصیل اپنے مقالات اور تصنیفات میں شرح و بسط سے پیش کی۔ اس نظام کے قیام سے اس جماعت کے حصولِ اقتدار اور مودودی صاحب کے آمرِ مطلق ہونے کی سب امیدیں خاک میں مل جاتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے اس تصور کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ میں نے پہلے دن سے یہ التزام رکھا ہے کہ جہاں بھی مرکزِ ملت کی اصطلاح استعمال کی ہے اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ اس سے مراد اس اسلامی مملکت کی سنٹرل اتھارٹی ہے جو علیٰ منہاجِ نبوت قائم کی جائے گی۔ میں نے اس نظام کی اطاعت کو خدا اور رسول کی اطاعت کے بمنزلہ قرار دیا تھا۔ نظامِ ربوبیت (قرآن کے معاشی نظام) کے سلسلہ میں بھی میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری اس نظام

(خلافت علیٰ منہاج نبوت) کے مرادف ہوگی۔ اور اس کے اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہوگا کہ ذرائع پیداوار اس نظام کی تحویل میں رہیں۔ میں شروع سے آخر تک، سیکولر نظام، اور اشتراکیت کے معاشی نظام کی شدت سے مخالفت کرتا چلا آرہا ہوں۔ میری ہزارہا صفحات پر مشتمل تحریریں اس حقیقت کی شاہد ہیں۔ لیکن ان لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ یہ میری اس وضاحت کا کبھی ذکر نہیں کرتے۔ اس کے برعکس، ان کی ٹیکنیک یہ ہے کہ یہ ہمارے برسراقتدار طبقہ کی عیاشیوں اور فحاشیوں کا چرچا کرتے ہیں اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ اس شخص (یعنی پرویز) کو دیکھئے کہ وہ ایسے لوگوں کی اطاعت کو خدا اور رسول کی اطاعت کے مرادف قرار دیتا ہے، اور ان کے سپرد ذرائع پیداوار کرنے کو اسلام کا معاشی نظام کہتا ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال ملاحظہ فرمائیے۔ ماہنامہ ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۷۶ء کے اشارات میں تحریر ہے۔

> اسی طرح آپ "نظام ربوبیت" پر غور کریں۔ یہ اصطلاح اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک دینی اصطلاح ہے۔ اور اسے سن کر کسی سلیم الفطرت انسان کے ذہن میں اسلامی نظام کا نقشہ ہی اجاگر ہوتا ہے۔ کیونکہ کائنات کے خالق نے انسان کی ساری احتیاجات کا بطریقِ احسن انتظام کر رکھا ہے۔ اس ذات نے ایک طرف اگر انسان کی مادی احتیاجات کی تسکین کے لئے ذرائع و وسائل مہیا کئے اور ضابطے مقرر فرمائے ہیں تو دوسری طرف انسان کی روحانی پیاس بجھانے اور اس کے اخلاقی احساسات کو زندہ رکھنے کا بھی پورا پورا التزام کیا ہے۔ لیکن مادی فلسفہ حیات خصوصاً اشتراکیت کے زیر اثر اس مقدس اصطلاح کو اس طرح بگاڑا گیا ہے کہ اسے سنتے ہی انسان کے ذہن میں ایک ایسے نظام کا تصور آتا ہے جس میں انسانوں کا ایک محدود سا گروہ مرکز ملت کے نام پر نہ صرف کسی ملک کے وسائل رزق پر قابض ہو، بلکہ اس کے سیاہ وسفید کا بھی پوری طرح مالک ہو۔ اور پھر وہ اپنی صوابدید کے مطابق عوام کو روٹی کے نوالے تقسیم کرے۔ کیا اس اصطلاح کے پردے میں اشتمالیت کا پرچار نہیں کیا جا رہا؟ یہ اصطلاح جب جدید مفہوم کے ساتھ سامنے آتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسے غالباً وضع ہی اس غرض کے لئے کیا گیا ہے کہ دنیا کو یہ باور کرایا جائے کہ کسی ملک کے وسائل معیشت پر حکومت کی مکمل اجارہ داری صرف اشتراکیت کا ہی طغرۂ امتیاز نہیں بلکہ اسلام بھی اس قسم کے جابرانہ نظام کا علمبردار ہے۔

اس سے ہمارے سادہ لوح عوام کے دلوں میں میرے خلاف جس قسم کے جذباتِ نفرت، اور خود مرکزِ ملت کی اصطلاح کے خلاف جس قسم کا باغیانہ تصور ابھرے گا وہ ظاہر ہے۔ یہ ہے وہ ٹیکنیک جس سے یہ حضرات ایک طرف علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ اور میرے وضاحت کردہ اسلامی نظام کا اس قدر بھیانک اور نفرت انگیز تصور لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ مودودی صاحب کی شخصیت کو ابھارتے چلے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ پچھلے سال انہوں نے ان کو "اللہ کے شاہکار" کے لقب سے بھی نوازا تھا۔

(۹)

یہ ہے برادرانِ عزیز! مختصر سی تفصیل اس نکتہ کی جسے میں نے پہلے پیش کیا ہے کہ اگر مودودی صاحب کے عزائم کی علمبردار اسلامی جماعت یہاں نہ اٹھتی تو اس خطۂ زمین میں اسلامی نظام، یعنی مملکت علیٰ منہاجِ نبوت ــــ کے قیام کے امکانات بڑے روشن تھے۔ اگر علامہ اقبالؒ زندہ رہتے تو وہ اس جماعت کی بھی اُسی طرح مخالفت کرتے جس طرح انہوں نے "احمدیوں" کی تحریک کی مخالفت کی تھی؛ اس لئے کہ وہ اس خطۂ زمین میں اسلامی نظام کے احیاء کی کوششوں کو ناکام ہوتے دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ یہ اُن کے ایمان کا تقاضا اور عشق کا منتہیٰ تھا۔ اور یہی کیفیت عزیزانِ من! اس ذرۂ ناچیز کی بھی ہے۔ صدیوں کے بعد یہ حسین اور تابناک تصور ہمارے سامنے آیا تھا۔ کوئی شخص جس کی نگاہوں میں قرآنی بصیرت اور سینے میں دردِ اسلام سے لبریز دل ہے، اس تصور کو یوں برباد ہوتے دیکھ نہیں سکتا۔

کے توانم دید ناہد جامِ صہبا بشکند
می پرد رنگم حبابے گر بدریا بشکند

(۱۰)

آخر میں میں پھر اس امر کی وضاحت کر دوں کہ اسلامی نظام کے احیاء اور قیام کے لئے جب بھی کہیں کوششیں شروع ہوں گی تو اس کا قیام ایک دن میں عمل میں نہیں آسکے گا۔ یہ بتدریج رفتہ رفتہ متشکل ہو سکے گا۔ علامہ اقبالؒ کے ذہن میں یہی نقشہ تھا اور میں بھی اس کی وضاحت کرتا چلا آرہا ہوں کہ ابتداءً مسلمانوں کی مختلف موجودہ مملکتوں کے وجود اور تشخص کو برقرار رہنے دیا جائے گا۔ لیکن ان میں ایک ایسا مرکزی وفاق قائم کیا جائے گا جس کی بنیادی شرط یہ ہوگی کہ یہ مملکتیں باہمدگر کبھی آمادہ بہ جنگ نہیں ہوں گی۔ ان کے اختلافی امور کے فیصلے اس آفاقی مرکز کی رو سے ہوں گے، اور جہاں تک ان کی خارجہ پالیسی کا تعلق ہے، ان میں سے کسی ایک کا دشمن، ان سب کا دشمن قرار پائے گا۔ ان کے آئین اور قوانین کی سند اور حجت خدا کی کتاب قرآنِ کریم ہوگی۔ اس کی حدود کے اندر رہتے ہوئے وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قوانین متعین کریں گے۔ ایسا کرنے میں ظاہر ہے کہ اس وقت جتنے قوانینِ شریعت

کے نام سے رائج ہیں، تدوینِ قوانین کے سلسلہ میں وہ ان سے استفادہ کریں گے۔ ان کے اس طرح مدون اور نافذ کردہ قوانین کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوگا۔ اس طرح مذہبی پیشوائیت کی اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔ اور اگلی شرط یہ کہ ان مملکتوں کے اربابِ اقتدار کی سیرت اسوۂ محمدی کے رنگ میں رنگی ہوگی ہے۔ اس طرح آغاز کار ہوگا تو پھر رفتہ رفتہ ایک دن یہ امت، امتِ واحدہ بن جائے گی۔ ان کا ایک ہی ضابطۂ قوانین ہوگا۔ ایک ہی مملکت اور اس مملکت کی ایک ہی سنٹرل اتھارٹی، جس کی اطاعت، خدا اور رسول کی اطاعت کے بمنزلہ قرار پائے گی۔ اور یہی وہ وحدت ہوگی جو آخر الامر وحدتِ انسانیہ کے اجتماعی نظام پر منتج ہوگی۔

لیکن یہ ضروری ہے کہ جب تک ایسا نہ ہو، مذہبی ارکان کی ادائیگی (نماز، روزہ وغیرہ) کے سلسلہ میں امت جن طریقوں پر چلی آرہی ہے۔ ان میں کسی قسم کا ردوبدل یا حک واضافہ نہ کیا جائے۔ البتہ ان میں جو امور قرآن کے خلاف ہوں، ان کی نشاندہی کی جائے۔ اور آخری بات یہ کہ یہ امت، بُری بھلی، جیسی بھی ہے، اس کے ساتھ وابستہ رہا جائے — علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو کہیں ان دلدوز الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:-

کہن شاخے کہ زیر سایۂ او پر برآوردی !
چو برگش ریخت از وے آشیاں برداشتن ننگ است

اور کہیں ان حسین اور سادہ الفاظ میں کہ :-

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ　　ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے　　کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دور　　خالی ہے جیبِ گل زرِ کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور　　رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو　　نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

(بانگِ درا)

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ اس پر مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں کہ یہ زندگی اسلامی زندگی ہے۔ ایسا سمجھنا فریبِ نفس ہوگا۔ سمجھا یہی جانا چاہیئے کہ یہ ہماری اضطراری حالت ہے۔ جس سے نکل کر، دین کے نظام کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا ہمارا فریضۂ حیات ہے۔ یاد رکھیئے جن کوششوں کو اس وقت "اسلامی خدمات" کہہ کر پکارا جاتا ہے، یہ سب "مذہبِ اسلام" کی تقویت اور فروغ کی کوششیں ہیں نہ کہ دینِ اسلام کی۔ اور اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہ کیجئے کہ مذہب جس قدر آگے بڑھتا جائے گا، دین اسی قدر پیچھے ہٹتا چلا جائے گا۔ اس حقیقت

کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے، خدا آپ کو توفیق دے تو آپ (ارمغانِ حجاز میں) اقبالؒ کی مایہ ناز نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔ بات سمجھ میں آجائے گی۔ اس میں ابلیس نے اپنے مشیروں سے کہا یہ ہے کہ:۔

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

اس امت کو بدستور سلائے رکھنے کی تدبیر یہ ہے کہ:۔

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اس وقت، اسلام کے فروغ کے نام سے جو کچھ کیا جارہا ہے، وہ اس امت کو مزاجِ خانقاہی میں پختہ تر کرنے کا ذریعہ ہے۔

یہ ہے عزیزانِ من! ذکرِ اقبالؒ کے سلسلہ میں میرا آج کا پیغام۔

والسّلام!

(خطاب کے چند ایک مقامات وضاحت اگلے پرچہ میں شائع ہوگا)

(٠)

اقبالؒ کے خلاف سازش

کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ سازش درحقیقت خود پاکستان کے خلاف ہے۔ اگر پاکستان سے اقبالؒ کی فکر اور پیغام کو نکال دیا جائے تو اس میں اور کسی سیکولر اسٹیٹ (مثلاً روس یا بھارت) میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔

۲۔ اقبالؒ کی فکر کا سرچشمہ قرآنِ حکیم ہے۔ اسلئے اقبالؒ کی فکر کو مسخ کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ قرآنی نظامِ حیات کا صحیح تصور نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔

۳۔ ان حالات اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ فکرِ اقبالؒ کو قرآنِ حکیم کی روشنی میں عام کیا جائے۔

۴۔ اس مقصد کو مفکرِ قرآن پرویز صاحب بطریق احسن پورا کر سکتے ہیں کہ انہوں نے اقبالؒ کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کیا ہے۔

۵۔ کوئی بیس سال اُدھر ادارہ طلوعِ اسلام نے علامہ اقبالؒ سے متعلق پرویز صاحب کے خطابات اور مقالات کا مجموعہ

اقبالؒ اور قرآن

کے نام سے شائع کیا تھا۔ وہ مجموعہ بھی مدت سے نایاب تھا۔ اور اس دوران میں پرویز صاحب نے علامہ اقبال سے متعلق مزید بہت کچھ کہا اور لکھا ہے۔ چنانچہ اب اس کا نیا ایڈیشن (۱۹۳۸ء سے ۱۹۷۷ء تک) مکمل کر کے نہایت حسن و خوبی سے شائع کیا گیا ہے۔

ضخامت (بڑی تقطیع کے) قریب تین سو صفحات۔ کاغذ عمدہ سفید۔ جلد پائیدار، گرد پوش دیدہ زیب۔ قیمت۔ پچیس روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

شہرۂ آفاق کتابیں جن سے صحیح اسلام سمجھ میں آسکتا ہے

من و یزداں

خدا پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے۔ قرآن دیگر اہل مذاہب کے خدا پر ایمان کو ایمان کیوں تسلیم نہیں کرتا۔ قرآن خدا کا کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس خدا کا ہمارے ساتھ کیا تعلق ہے؟

قیمت مجلد ۔ پچیس روپے ۲۵/-

ابلیس و آدم

پہلا انسان کس طرح وجود میں آیا قصۂ آدم کا مفہوم کیا ہے؟ ابلیس و آدم کی کشمکش، شیطان، ملائکہ، جنات، وحی، نبوت، رسالت جیسے اہم بنیادی نظریات کا صحیح تصور علوم حاضرہ کی روشنی میں۔

قیمت مجلد پچیس روپے ۲۵/-

جوئے نور

حضرات انبیائے کرام اور اقوام سابقہ کی سرگذشت، آسمانی انقلاب کے خلاف مفاد پرست گروہوں کا محاذ، ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داروں کی تباہ کاریاں، (حضرت نوحؑ سے حضرت شعیبؑ تک)

قیمت مجلد پچیس روپے ۲۵/-

برق طور

صاحب ضرب کلیم اور فرعونیت کی آویزش، داستان بنی اسرائیل، قوموں کے عروج و زوال کے ابدی اصول، شوکت سلیمانی اور سطوت داؤدی، یہودی ذہنیت اور اس کا انجام کیا یہودیوں کی مملکت کبھی قائم نہیں ہوسکتی؟ ارض مقدس کی داستان

قیمت مجلد پچیس روپے

شعلۂ مستور

حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کے کوائف حیات۔ کیا حضرت عیسیٰ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ کیا وہ زندہ آسمان پر تشریف فرما ہیں۔ کیا وہ پھر سے زمین پر اتریں گے؟ واقعۂ تصلیب کی حقیقت کیا ہے۔ قرآن کریم اور عصر حاضر کے محققین کے نزدیک بصیرت افروز حقائق، حقیقت کشا معلومات۔

قیمت مجلد پچیس روپے ۲۵/-

ختم نبوت اور تحریک احمدیت

مقام نبوت کیا ہے؟ ختم نبوت کی حقیقت اور اہمیت کیا ہے؟ سلسلۂ وحی کیوں بند کیا گیا؟ رسالت محمدیہ کس طرح ابدیت درکنار ہے "آنے والے" کا عقیدہ کس طرح پیدا ہوا؟ تحریک احمدیت کی اصل و حقیقت اور غرض و غایت؟ احمدی لٹریچر والے لاگ تجزیہ اور تبصرہ۔ بڑی اہم کتاب ہے۔

قیمت مجلد پندرہ روپے ۱۵/-

ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

اسلامی نظریاتی کونسل کا سوالنامہ

(بابت ربٰو)

[اسلامی نظریاتی کونسل نے ربٰو کے متعلق جو سوالنامہ جاری کیا ہے، اس پر ہمارا تبصرہ طلوع اسلام بابت اپریل ۱۹۷۶ء کے لمعات میں شائع ہو چکا ہے۔ کونسل نے اپنا سوالنامہ پرویز صاحب کو بھی بغرض استصواب رائے بھیجا تھا۔ ذیل میں پرویز صاحب کا جواب درج کیا جاتا ہے۔ (طلوع اسلام)]

(۱)

محترمی۔ السلام علیکم!

آپ کا گرامی نامہ نمبری ایف۔ ۱ (۵) / ۷۵۔ سی۔ آئی۔ آئی (پی۔ ۲) مؤرخہ ۱۱ مارچ ۱۹۷۶ء مجھے ۲۲ مارچ ۱۹۷۶ء کو ملا۔ میں ... اسلامی نظریاتی کونسل کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے ایسے اہم مسئلہ میں مجھ سے استصواب رائے ضروری سمجھا ہے۔ لیکن میں اس سوال نامہ کا جواب دینے کی بجائے ایک اصولی گفتگو ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ میرے خیال میں جب تک ان اصولوں کو طے نہ کر لیا جائے، اسلامی قوانین کی تدوین کے سلسلے میں کونسل کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ مجھے امید ہے کہ کونسل کے محترم اراکین، بالخصوص اس کے صدر محترم میری ان گزارشات کو اپنی خصوصی توجہ کا مستحق قرار دیں گے۔

(۲) کونسل کے ذمے یہ فریضہ عاید کیا گیا ہے کہ وہ (۱) مروجہ قوانین کو اسلامی قوانین کے مطابق بنانے کے لئے اپنی سفارشات پیش کرے اور (۲) یہ دیکھے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ تو نہیں ہوتا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔ اس میں "اسلامی قوانین" اور "کتاب و سنت" کی دو اصطلاحات ایسی ہیں کہ جب تک ان کا مفہوم اور مدلول متعین نہ ہو جائے، اس سلسلے میں کوئی کامیاب قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ میری معروضات اسی نکتہ سے متعلق ہیں۔

(۳) تمہیدی طور پر بات ایک مثال سے واضح ہو جائے گی۔ جب کسی عدالت میں یہ سوال پیش ہو کہ فلاں قانون آئین پاکستان کے مطابق ہے یا نہیں، تو اس کا فیصلہ اس لئے ممکن

اور آسان ہو جاتا ہے کہ آئینِ پاکستان ایک متعین دستاویز ہے جو ایک کتاب کی شکل میں موجود ہے اُس کتاب کے مندرجات کے حوالے سے اس سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح جب یہ سوال زیرِ غور آتے کہ کسی شخص کا فلاں فعل قانون کے خلاف ہے یا نہیں تو اس کا فیصلہ بھی آسانی سے ہو سکتا ہے کیونکہ پاکستان کے قوانین کے ضوابط بھی کتابی شکل میں موجود ہوتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں چیز اسلامی قانون کے مطابق ہے یا نہیں، تو "اسلامی قوانین" سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے۔ پاکستان میں مسلمانوں کے مختلف فرقے ہیں اور ہر فرقہ اپنی فقہ کے قوانین کو اسلامی کہہ کر پکارتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ مختلف فرقوں کی طرف سے اس سوال کا جواب مختلف ہوگا۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے ذمے کسی خاص فرقے کے لئے قوانین مرتب کرنا نہیں۔ اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ایسے قوانین مرتب کرنے کی سفارش کرے جن کا اطلاق مملکت کے تمام باشندوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ سوال یہ ہے کہ کیا کونسل کے پاس کوئی ایسا معیار ہے جس کی رو سے وہ یہ فیصلہ کرے کہ فلاں قانون اسلام کے مطابق ہے یا نہیں اور اس معیار کو تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کرتے ہوں؟ اگر ایسا نہیں تو ظاہر ہے کہ کونسل کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں کر سکتی جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں۔ یہ سب سے پہلا اصولی سوال ہے۔ اسے حل کئے بغیر کونسل کی کوئی کوشش بھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔

(۴) دوسرا سوال "کتاب و سنت" سے متعلق ہے۔ "کتاب" سے مراد تو (ظاہر ہے کہ) قرآن مجید ہے جو ایک کتاب کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ لیکن اس کے احکام کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ ان کی وہی تشریح اور تعبیر صحیح تسلیم کی جا سکتی ہے جو "سنت" کے مطابق ہو۔ بنا بریں اسلامی قوانین کی تدوین کے سلسلے میں "سنت" کی حیثیت مرکزی قرار پاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے ہاں کوئی کتاب ایسی ہے جس کے مندرجات کو تمام فرقے متفقہ طور پر سنت تسلیم کرتے ہوں؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔ ایسی کتاب کا وجود تو درکنار خود "سنت" کی تعریف (DEFI - NITION) میں بھی اختلاف ہے جیسا کہ ذیل کی تصریحات سے واضح ہے۔

(۵) بعض حضرات کے نزدیک "سنت" اور "حدیث" میں کوئی فرق نہیں۔ ہر حدیث سنت ہے لیکن دوسرے حضرات کے نزدیک ایسا سمجھنا صحیح نہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ سنت، احادیث سے مستنبط کی جاتی ہے۔ جہاں تک احادیث کا تعلق ہے:

> ۱۔ اہلِ حدیث کے نزدیک "جو احادیث قواعدِ صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں، ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مطابق ...... بخاری اور مسلم کی احادیث کی صحت پر امت متفق ہے۔ ان کی صحت قطعی ہے۔ (بحوالہ جماعتِ اسلامی کا نظریہ حدیث۔ از مولانا محمد اسمٰعیل، مرحوم)

اس کے برعکس۔

(ب) حنفی حضرات کے نزدیک مسلم اور بخاری کی تقریباً دو سو احادیث ایسی ہیں جن کی صحت پر اتفاق نہیں بلکہ وہ محلِ اختلاف ہیں۔ (ارشادِ گرامی، مولانا ظفر علی عثمانی مرحوم)، انکے نزدیک وہ احادیث صحیح ہیں جن کے مطابق فقہ حنفی مرتب ہوئی ہے۔

(س) پاکستان میں جماعتِ اسلامی بھی نفاذِ شریعت کی مدعی ہے۔ ان کے نزدیک احادیث کی پوزیشن سب سے الگ ہے۔ اس جماعت کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا موقف یہ ہے کہ احادیث کے صحیح اور ضعیف یا وضعی ہونے کا فیصلہ سند اور دلیل کی رُو سے نہیں ہوتا۔ اس کا فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے "جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرے کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو۔ کثرتِ مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ کا "مزاج شناس" ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد وہ اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ (تفہیمات۔ حصہ اول)

احادیث کے متعلق یہ پوزیشن اہل سنت والجماعت کی ہے۔ شیعہ حضرات کے احادیث کے اپنے مجموعے ہیں۔

(د) جہاں تک احادیث کی رُو سے سنت کے مستنبط کرنے کا تعلق ہے، مودودی صاحب کا اس باب میں موقف یہ ہے کہ "سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کئے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق و امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کون سا جز سنت ہے اور کون سا جز عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو ...... جو چیزیں حضورؐ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرزِ معاشرت اور آپ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں انہیں سنت بنانا مقصود نہیں تھا...... اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر اُن کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریف دین ہے۔" (رسائل و مسائل حصہ اول)

یہ بات بھی احادیث کے کسی مجموعہ میں واضح نہیں کہ حضورؐ کا کونسا عمل سنت تھا اور کون سا عادت۔ اس لئے اسے بھی (بقول مودودی صاحب) مزاج شناس رسول ہی متعین کرے گا۔ اس نہج سے دیکھئے تو دین سارا مزاج شناس رسولؐ کی نگہ بصیرت میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جن قوانین کا معیار یہ ہو انہیں متفقہ طور پر کس طرح اسلامی تسلیم کیا جا سکے گا۔ چنانچہ

جمعیتِ اہلِ حدیث کے سابق صدر (مولانا محمد اسمٰعیل مرحوم) نے مودودی صاحب کے اس مسلک کو "سنت کے خلاف ہوائی قلعوں" سے تعبیر کیا اور کہا کہ وہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے۔

(جماعتِ اسلامی کا نظریہ حدیث)

(۷) میں نے نہایت مختصر الفاظ میں یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ حدیث اور سنت کے متعلق مختلف فرقوں اور جماعتوں میں کس قدر بنیادی اختلافات ہیں اور جب یہ کہا جائے کہ قرآنِ مجید کے احکام کی وہی تعبیر اور تشریح اسلامی تسلیم کی جا سکتی ہے جو سنت کے مطابق ہو تو آپ سوچئے کہ کیا کتاب و سنت کی رو سے کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب کیا جا سکتا ہے جو ان تمام فرقوں اور جماعتوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کیا جا سکے۔ اسی وقت کے پیشِ نظر مودودی صاحب کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ (یہ الگ بات ہے کہ اس کے باوجود وہ اپنے اس مطالبہ پر زور دیئے جا رہے ہیں کہ حکومت کتاب و سنت کے مطابق ضابطہ قوانین نافذ کرے)

(ضمناً میں نے اس سلسلے میں فرقہ اہلِ قرآن کا قصداً ذکر نہیں کیا کیونکہ وہ چند نفوس پر مشتمل ایک نہایت مختصر سا ٹولہ ہے جس کی کوئی مؤثر حیثیت نہیں۔

(۸) تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جب تک ان اصولی امور کا متعین طور پر فیصلہ نہ کر لیا جائے، قانون سازی کے سلسلے میں کوئی اقدام نتیجہ خیز نہیں ہو سکے گا۔ ۱۹۵۶ء کے آئین کی رو سے جو لاء کمیشن مقرر ہوا تھا۔ (جسٹس) شیخ محمد شریف (مرحوم) اس کے چیئرمین تھے۔ اور یہ راقم اس کا ایک رکن۔ ہم نے طے یہ کیا تھا کہ پہلے یہ متعین کیا جائے کہ اسلام میں قانون سازی کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اس کے بعد ان اصولوں کی روشنی میں مروجہ قوانین کی چھان بین کی جائے۔ لیکن افسوس کہ ہم ابھی اس کے مبادیات بھی طے نہ کرنے پائے تھے کہ ۱۹۵۸ء کے عسکری انقلاب نے اس آئین کو منسوخ کر دیا۔ اور اس کے تابع مقرر شدہ ادارے بھی از خود منسوخ قرار پا گئے۔ اور آئین سازی کے سلسلے میں کوئی قدم آگے نہ بڑھایا جا سکا۔ یہ سلسلہ تو وہیں ختم ہو گیا لیکن ہمارے علمائے کرام کے نزدیک یہ تجویز (کہ پہلے آئین سازی کے اصول متعین کر لئے جائیں) ایسی "خطرناک" تھی جس کا سدِ باب نہایت ضروری سمجھا گیا۔ اس مقصد میں تدبیر یہ اختیار کی گئی کہ میرے خلاف یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا جائے کہ میں "منکرِ حدیث" اور "منکرِ سنت" ہوں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ میں اسی انداز سے سنت کا اتباع کرتا ہوں جس انداز سے خود یہ حضرات اتباعِ سنت کرتے ہیں۔ البتہ مروجہ عقائد یا مسلک میں جو امور خلافِ قرآن ہیں، میں ان کی نشاندہی کرتا رہتا ہوں۔ میرا مسلک یہ ہے کہ امت جن طریقوں سے متعلقہ ارکانِ اسلام — نماز، روزہ وغیرہ — پر عمل پیرا چلی آ رہی ہے۔ اُن میں کسی قسم کے تغیر و تبدل یا حک و اضافہ کا اختیار کسی فرقہ یا کسی فرد کو نہیں۔ اسی طرح امت کے لئے قانون سازی کا اختیار بھی کسی فرد یا فرقہ کو نہیں۔ یہ اختیار، اسلامی مملکت

کو حاصل ہو گا اور اسلامی مملکت سے مراد وہ مملکت ہے جو علیٰ منہاج نبوت قائم ہو جیسی نے تصریح
اس لئے ضروری بھی ہے کہ اگر اسلامی نظریاتی کونسل نے اصول متعین کرنے کے سلسلے میں
کوئی قدم اٹھایا تو عین ممکن ہے کہ اُس کے اس اقدام کی بھی مخالفت ہو۔

لیکن سوال مخالفت یا موافقت کا نہیں۔ سوال اس سے کہیں اہم ہے۔ اور وہ ہے پاکستان میں اسلام کے مستقبل کے متعلق۔ جیسا کہ میں اوپر عرض کر آیا ہوں، جب تک یہ اصول متعین نہیں ہوں گے، اسلامی قوانین کی تدوین کی کوئی کوشش نتیجہ خیز نہیں ہو سکے گی۔ ہمارے ہاں کے نئی نسل کے تعلیم یافتہ طبقہ میں پہلے ہی یہ خیال عام ہوتا جا رہا ہے کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے۔ وہ کسی پچھلے زمانے میں تو قابلِ عمل تھا لیکن اب وہ موجودہ دور کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ لہٰذا اب ہمیں زمانے کی عام روش کے مطابق اپنے لئے 'آپ' قوانین مرتب کرنے چاہئیں۔ اگر اسلامی نظریاتی کونسل کوئی متفق علیہ اسلامی قوانین کا ضابطہ مرتب کرنے میں ناکام رہ گئی تو ان نوجوانوں کے اس خیال پر مہر تصدیق ثبت ہو جائے گی۔ اور اس کے بعد وہ نفسِ اسلام ہی سے منحرف ہو جائیں گے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کی رو سے میں مخالفتوں کے اس ہجوم کے باوجود اپنی اس پکار کو دہراتے جا رہا ہوں کہ جب تک یہ اصول طے نہیں پائیں گے پاکستان میں اسلام کا احیاء نہیں ہو سکے گا۔ اور یہی وہ جذبہ ہے جس کے ماتحت میں نے اپنی ان گزارشات کو اسلامی نظریاتی کونسل تک پہنچانا ضروری سمجھا ہے۔ میں نے ایک عمر انہی مسائل پر غور و فکر میں گزاری ہے اور اس کی روشنی میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ ایسے اصول متعین کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے جرأت کی ضرورت ہوگی۔ اگر کونسل یہ جرأت مندانہ قدم اٹھا سکتی ہے تو زہے قسمت۔ اس سے وہ ایک ایسا کارنامہ سرانجام دے جائے گی جو اُسے حیاتِ دوام کا مستحق بنا دے گا۔ لیکن اگر وہ سمجھتی ہے کہ اُس کے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں تو میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ وہ اپنی عظیم ذمہ داری کو مدنظر رکھتے ہوئے اس امر کا اعتراف کرے کہ بحالات موجودہ کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب کرنا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پا سکے، اُن کے بس کی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں سے انہیں اس اعترافِ حقیقت کا اجر ملے گا۔

(۹) چونکہ یہ مسئلہ نجی یا پرائیویٹ نہیں، اس کا تعلق اجتماعی طور پر پوری کی پوری امت مسلمہ سے ہے اس لئے میں اپنے اس خط کو بغرض اشاعت پریس میں دے دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کونسل بھی اگر چاہے تو اسے شائع کر سکتی ہے۔

(۱۰) ارکان و صدر کونسل کی خدمت میں میرا ہدیہ سلام پیش کر دیا جائے۔

والسلام
(نیاز آگیں) پرویز
۲/۷۶

بخدمت گرامی محترم شیخ اختر علی صاحب
سیکرٹری، اسلامی نظریاتی کونسل۔ لاہور

باب المراسلات

قرآن مجید کی حفاظت

قارئین میں سے ایک صاحب نے اپنے کسی ملنے والے کی طرف سے اٹھایا گیا ایک اعتراض پیش کیا ہے جس کا جواب طلوع اسلام میں شائع کرنا مناسب سمجھا گیا ہے۔ اعتراض یہ ہے :-

خدا کی طرف سے انبیاء سابقہ کو جو کتابیں دی گئیں ان کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ نہیں لیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں انسانوں نے تحریف کر دی۔ آخر میں خدا نے ضروری سمجھا کہ اپنی کتاب کی حفاظت خود ہی کرنی چاہیئے تو قرآن شریف کے سلسلہ میں یہ کہہ دیا کہ اس کی حفاظت ہم خود کریں گے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کے دل میں یہ خیال، سابقہ تجربات کی ناکامی کے بعد پیدا ہوا۔ خدا کے متعلق اس قسم کا تصور یکسر باطل دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اگر یہ بات یوں نہیں تو پھر اس کا جواب کیا ہے ؟

طلوع اسلام: خدا کے متعلق اس قسم کا تصور فی الواقعہ باطل ہے، اور پیدا ہوتا اس غلط مفروضہ سے جس پر مذکورہ بالا اعتراض کی بنیاد ہے۔ وہ مفروضہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کتب سابقہ کو ابدی طور پر محفوظ رکھنا چاہتا تھا لیکن انسانوں نے ایسا نہ ہونے دیا، تو اس کے بعد خدا نے یہ سوچا کہ اسے اپنی کتاب کی حفاظت آپ کرنی چاہیئے۔ صحیح صورت یہ نہیں۔ کتب سابقہ کا ابدی طور پر محفوظ رکھے جانا مشیت خداوندی کا مقصود تھا ہی نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کتابیں تمام نوع انسان کے لئے ابدی طور پر ضابطہ ہدایت قرار دیئے جانے کے لئے نازل نہیں کی گئی تھیں۔ ان ادوار میں ہوتا یہ تھا کہ ایک رسول ایک خاص قوم کی طرف مبعوث ہوتا۔ اس کی تعلیم کا دائرہ اثر و نفوذ بھی ایک خاص خطہ زمین تک محدود ہوتا۔ اس کی طرف نازل کردہ کتاب میں، جو جزئی احکام شریعت دیئے جاتے، وہ اس قوم اور اس زمانہ کے حسب حال ہوتے۔ جب زمانہ ذرا اور ترقی کر جاتا تو سابقہ احکام میں سے جو اس قابل ہوتے کہ وہ اس دور میں بھی نافذ العمل رہ سکیں، انہیں بحال رہنے دیا جاتا۔ جو اس قابل نہ رہتے ان کی جگہ دوسرے احکام دے دیئے جاتے۔ یوں ان سابقہ کتابوں کے (یوں سمجھئے کہ) ستے

ایڈیشن شائع کر دیئے جاتے (واضح رہے کہ دین کے اصول تو وہی رہتے ہیں کیونکہ وہ غیر متبدل تھے۔ اس تبدیلی کی ضرورت ان احکامِ شریعت میں لاحق ہوتی جو وقتی تقاضوں کے مطابق دیئے جاتے تھے۔ یہ تصریح خود قرآن مجید میں موجود ہے جب کہا کہ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا۔ (2/106) یہ ایک رسول کے بعد جب دوسرا رسول آتا تو اس وقت دیکھا جاتا کہ سابقہ رسول کی وساطت سے دیئے گئے احکامِ شریعت میں سے جو نافذ العمل رہنے کے قابل نہیں رہے، انہیں منسوخ کر کے ان کی جگہ جدید احکام دے دیئے جاتے اور جن احکام میں تبدیلی کی ضرورت نہ ہوتی لیکن انہیں سابقہ رسول کی امت نے) فراموش کر دیا ہوتا، ان کی تجدید کر دی جاتی۔ سورۃ النحل میں اس کی وضاحت وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ (16/101) کہہ کر دی گئی ہے یعنی ایک حکم کی جگہ دوسرا حکم دے دینا۔" اب ظاہر ہے کہ جو کتابیں دی ہی وقتی طور پر گئی تھیں، ان کا ابدی طور پر محفوظ رکھے جانا مقصودِ مشیت تھا ہی نہیں۔

وحیٔ خداوندی کا یہ سلسلہ اسی انداز سے جاری رہا تا آنکہ مشیت کے پروگرام کے مطابق ایک ایسی کتاب کا دیا جانا ضروری سمجھا گیا جو تمام نوعِ انسان کے لئے، ابدی طور پر ضابطۂ ہدایت بننے کے قابل ہو۔ یہ کتاب (قرآن کریم کی شکل میں) دی گئی۔ اس کے متعلق اعلان کر دیا کہ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6/115)۔ "تیرے رب کے قوانین اس کتاب میں تکمیل تک پہنچ گئے۔ اب ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ جو کتاب مکمل بھی ہو گئی، اور غیر متبدل بھی قرار دے دی گئی، اس کا ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھا جانا بھی ضروری تھا۔ اس بنا پر خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا (15/9) اور اس کے بعد سلسلۂ وحی کے ختم کر دینے کا اعلان کر دیا چونکہ قرآن کریم کو تمام نوعِ انسان کے لئے ابدی طور پر ضابطۂ ہدایت بننا تھا، اس لئے اس میں احکامِ شریعت بہت کم دیئے گئے ہیں۔ اس کی تعلیم بیشتر ان اصولوں پر مبنی ہے جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہیں۔ اس کتاب کے متبعین سے کہہ دیا گیا ہے کہ وہ ان غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، جزئی احکام اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود مرتب کریں وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42/38) کا یہی مطلب ہے۔ یہ اصول تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کی روشنی میں وضع کردہ احکام، زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ (اس طرح احکام وضع کرنے کا فریضہ قرآنی مملکت ادا کرے گی جسے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت بھی کہا جاتا ہے۔

انبیائے سابقہ کے زمانے میں وقتی احکام کی کیا صورت تھی، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب حضرت نوحؑ سے کہا گیا کہ سیلاب سے بچنے کے لئے کشتی کی ضرورت ہو گی تو انہیں یہ بھی وحی کی رو سے بتانا پڑا کہ کشتی کس طرح بنائی جاتی ہے (11/37)۔ ظاہر ہے کہ جب زمانہ ذرا آگے بڑھا تو کشتی بنانے سے متعلق آسمانی ہدایات کی ضرورت نہ رہی (حتیٰ کہ اس قسم کی کشتی کی بھی ضرورت نہ رہی جیسے حضرت نوحؑ نے بنایا تھا) یہ تو صرف ایک مثال ہے۔ آپ تورات (یا بائبل کے عہد نامہ عتیق) کو دیکھئے،

اس میں چھوٹی چھوٹی سی باتوں کے لئے بھی کس تفصیل اور کثرت کے ساتھ احکام ملتے ہیں۔ اس قسم کے جزئی اور تفصیلی احکام اُس زمانہ کی وقتی ضروریات پوری کرنے کے لئے تھے۔ وہ ابدی طور پر غیر متبدل قرار نہیں پا سکتے تھے۔ ابدی طور پر وہی نظام کارفرما رہ سکتا ہے جسے قرآنِ کریم نے تجویز کیا ہے یعنی غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں وقتی احکام خود مرتب کرنا۔

(ضمناً) ہمارے ہاں جب قرآنی نظامِ مملکت باقی نہ رہا تو قرآن کریم نے جس بلند و بالا حکمت کے پیشِ نظر جزئی احکام خود نہیں دیئے تھے، وہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ سمجھا یہ گیا کہ اسلام مکمل اور آخری دین اسی صورت میں قرار پا سکتا ہے۔ جب اس میں، زندگی کے تمام تقاضوں کے لئے چھوٹے سے چھوٹے احکام بھی موجود ہوں اور وہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں۔ قرآن کریم میں تو یہ احکام تھے نہیں اس لئے انہیں خود مرتب کر لیا گیا اور انہیں ابدی قرار دے دیا۔ انہیں احکامِ فقہ کہا جاتا ہے۔ سابقہ شریعتوں کے ناقابلِ عمل احکام کو بدلنے کے لئے تو بعد کے رسول آیا کرتے تھے۔ لیکن اب چونکہ سلسلۂ نبوت ختم ہو چکا ہے۔ اس لئے اِن احکام (فقہ) کو بدلنے کے لئے کوئی رسول بھی نہیں آئے گا۔ یہ ہے وہ مقام جس پر ہم صدیوں سے کھڑے ہیں۔ بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ انسانوں کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے خود ساختہ احکام کو احکامِ شریعت کہہ کر امت سے ان پر عمل کرائیں۔ یہ احکام خدا کی طرف سے ملنے چاہئیں۔ اس خیال کے تابع وہ لگے قرآن کریم سے احکامِ فقہ تلاش کرنے! لیکن قرآنِ کریم میں یہ احکام تھے نہیں۔ تو اب کیا کیا جائے!! اب وہ لگے اندھوں کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارنے، اور وہ احکام جو قرآن میں تھے نہیں، انہیں قرآن سے تلاش اور متعین کرنے۔ اس کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اسے تلاعب بالدین ___ دین سے مذاق کرنے ___ کے سوا اور کیا کہا جا سکے۔ یہ حضرات اپنے آپ کو اہلِ قرآن کہتے ہیں مصیبت یہ کہ اہلِ فقہ نے جو احکام مدون کئے تھے، انہیں بہرحال انسانوں کے وضع کردہ احکام ہی کہا اور سمجھا جاتا ہے خواہ ان انسانوں کا پایہ کتنا ہی بلند کیوں نہ تصور کر لیا جائے۔ لیکن یہ لوگ (اہلِ قرآن) جو احکام پیش کرتے ہیں ان کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ خود خدا کے مقرر کردہ احکام ہیں! یا للعجب!!

یہ تمام الجھنیں اس لئے پیدا ہو رہی ہیں کہ (۱) اللہ تعالیٰ نے جس حکمت اور غایت کے لئے قرآن کریم کو اس انداز کی کتاب ہدایت بنایا تھا، وہ غایت نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہے اور (۲) جس نظام نے اس کتاب پر عمل کرانا تھا، وہ نظام قائم نہیں رہا۔ اب ہر شخص اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو اس کی دانست میں (معاذ اللہ) قرآن میں رہ گئی ہے۔ اسی غلط نگہی یا گمراہی کی ایک مظہر قادیانی نبوت تھی جس کے مدعی نے آکر یہ کہا کہ جہاد کا حکم ایک وقت تک کے لئے تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کرنا ضروری سمجھا تو مجھے بھیج دیا کہ میں اس کے منسوخ ہونے کا اعلان کر کے قرآن میں ترمیم کر دوں۔ (معاذ اللہ)۔ آپ نے دیکھا کہ ایک نظامِ قرآنی کے قائم نہ رہنے سے امت کس کس قسم کی گمراہیوں میں مبتلا ہو گئی ؟

لاعلاج مریضوں کا مسئلہ

ہم نے طلوع اسلام کی اشاعت بابت فروری ۱۹۷۶ء (کے حقائق وعبر) میں لکھا تھا کہ آجکل امریکہ کی عدالت میں ایک اہم مسئلہ زیر غور ہے اور وہ یہ کہ اگر ایک مریض، ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق، لاعلاج ہو اور وہ نہایت کرب واذیت سے بقایا سانس گن رہا ہو، تو کیا اسے، ازرہ ہمدردی، خود مار دینا جائز ہوگا؟ ہم نے اس شذرہ کے آخر میں لکھا تھا کہ ہمارے ہاں کے ڈاکٹر صاحبان اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں تو طلوع اسلام اسے بخوشی شائع کریگا۔ اس سلسلہ میں ہمیں کراچی کے ڈاکٹر حبیب الرحمٰن خان صاحب کا ذیل کا گرامی نامہ موصول ہوا ہے جسے بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔

" طلوع اسلام کے فروری کے پرچہ میں جناب نے ڈاکٹر صاحبان سے ایک بڑا اہم غور طلب مسئلہ کے متعلق توجہ دلائی ہے۔ زیر غور مسئلہ اس جوان لڑکی کے بارے میں ہے جو گزشتہ کئی ماہ سے گہری غشی کے عالم میں پڑی ہے اور اسے صرف مصنوعی تنفس کے آلات سے زندہ رکھا جارہا ہے۔ وہاں کے ڈاکٹروں کی رائے میں وہ کبھی ہوش میں نہیں آسکے گی۔ اس کے والدین کی خواہش اس کے متعلق یہ ہے کہ وہ اس مصنوعی تنفس کو بند کر دیں تاکہ وہ بیچاری آرام واحترام سے موت کے آغوش میں چلی جائے۔ ان ڈاکٹر صاحبان نے ان کی یہ درخواست یہ کہہ کر مسترد کر دی ہے کہ ہمارا یہ اقدام طب کے ضابطہ اخلاق کے خلاف ہوگا۔ ہمارا کام انسانوں کو زندہ رکھنے کی کوشش کرنا ہے نہ کہ ان کو مار دینا۔ اس قصہ کو عدالت کی طرف رجوع کیا گیا ہے اور یہ اس لڑکی کے والدین نے کیا ہے۔

ہمیں معاملہ کے بنیادی پہلو کی طرف آنا ہے۔ میڈیکل سائنس کی تاریخ کی طرف نظر ڈالیں تو ہمیں اس سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ گزشتہ چالیس برس میں میڈیکل سائنس کی تحقیق نے وہ کارنامے انجام دیئے ہیں جن کی کوئی مثال باقی وقت میں نہیں ملتی۔ تشخیص اور علاج .... دونوں کے طریق میں بے حد ترقی ہوئی ہے اور بنی نوع انسان کو بہت سی ایسی بیماریوں سے چھٹکارا ملا ہے جن کے متعلق اس سے پہلے یہ سوچا جاتا تھا کہ وہ لاعلاج ہیں۔ میرے اپنے تجربہ میں ایسے بیشمار مریض آتے ہیں جن کا میڈیکل سائنس کے اندازوں سے ان حالتوں میں بچنا اگر ناممکن نہیں تو بہت مشکل تھا۔ مجھے ان مریضوں کو بہتر اور تندرستی کی طرف آتے دیکھ کر انتہائی خوشی بھی ہوئی اور تعجب بھی۔ ہر وقت میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ جہاں انسانی علمی اور تحقیقی حد ختم ہوتی ہے وہ اس کا علم کارفرما ہے جو لامحدود ہے اور جو عقل انسانی میں آ ہی نہیں سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں جن باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے بتائے ہوئے قوانین کے مطابق اپنی جدوجہد جاری رکھیں اور قوانین فطرت کے پردے میں اپنی مسلسل کوشش و

کے سامنے یکے بعد دیگرے بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ہم ان کو پوری انسانیت کے فائدے کے لئے استعمال کریں۔

سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۔ ان ڈاکٹروں کی نگاہ میں ان موجودہ تجربوں کی بنا پر وہ کبھی ہوش میں نہیں آسکے گی۔ ہوسکتا ہے کہ آئندہ چند ہی دنوں میں یا چند ماہ میں ایسی دوائیں نکل آئیں جن کے استعمال سے اسے دوبارہ ہوش میں لایا جا سکے۔ اس لئے جہاں میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ ان کا اپنی کوششوں کو جاری رکھنا ضروری ہے وہاں ہمیں کل کی طرف سے ناامید ہونے کی ضرورت نہیں اور ایک مسلمان کی حیثیت سے ناامید ہونا کفر بھی تو ہے۔"

(نیازمند)
ڈاکٹر حبیب الرحمٰن خان۔ ایم ۔ ڈی ۔ ایف سی سی ۔ پی (امریکہ)
۲۴ گارڈن ایسٹ۔ کراچی (۳)

يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ
إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ
جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۖ

O ye who believe! Fear God as He should be feared,
and die not except in a state of Islam. And hold fast,
all together, by the Rope which God stretches out
for you, and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO
INDUSTRIES LIMITED

نقد و نظر

۱- تطہیر بائبل (جلد اوّل) :- مصنف :- اعجاز چوہدری۔

ناشر۔ فیتھ پبلیشرز۔ ونڈالہ روڈ۔ شاہدرہ غربی۔ لاہور۔ کتابت طباعت۔ عمدہ۔
کتاب پر قیمت درج نہیں۔

قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ یہود و نصاریٰ کی (مبینہ) آسمانی کتابوں میں تحریف ہو چکی ہے۔ اس لئے وہ دینِ خداوندی کے لئے سند نہیں قرار پا سکتیں۔ اس موضوع پر ہمارے ہاں کے متقدمین اور متاخرین نے بہت کچھ لکھا ہے جس سے یہ حقیقت بدلائل و شواہد واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کتابیں فی الواقعہ محرف ہیں۔ پرویز صاحب نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا اور تاریخی سندات کے حوالوں سے ثابت کیا کہ یہود و نصاریٰ ہی نہیں، بلکہ جملہ اہل مذاہب میں سے کسی کے ہاں بھی ان کی مبینہ آسمانی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں۔ ان کی اس تصنیف ("مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں") نے بڑی شہرت حاصل کی۔

زیرِ نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے لیکن اس کی انفرادیت اس میں ہے کہ اس کے مصنف بھی ایک عیسائی ہیں اور اسے شائع بھی ایک مسیحی ادارہ نے کیا ہے۔ مصنف نے کتابِ مقدس (بائبل) کے اندرونی تضادات سے ثابت کیا ہے کہ اس میں انسانی خیالات اور غیر مستند واقعات کی آمیزش ہو چکی ہے۔ اور بعض مقامات پر یہ بھی کہا ہے کہ اس کے مقابلہ میں جو کچھ مسلمانوں کے ہاں پایا جاتا ہے وہ صحیح اور مستند ہے۔ کتاب کی زیرِ نظر جلد (اول) کا تعلق زیادہ تر عہد نامہ عتیق سے ہے۔ اور عہد نامہ جدید کی رو سے صرف حضرت مسیحؑ کی حیاتِ طیبہ کے ابتدائی احوال و کوائف سے بحث کر کے، یہ ثابت کیا گیا ہے کہ آپؑ "جبلی اور فطری طور پر ہماری طرح انسان" اور نبی تھے (ص ۱۳-۳۸)

مصنف نے "مذہبی ٹھیکہ داروں" کو بالخصوص اپنی تنقید کا ہدف بنایا ہے۔ لیکن نہ دامنِ تہذیب کو کہیں ہاتھ سے چھوڑا ہے، نہ اسلوبِ بیان میں سوقیانہ پن آنے دیا ہے۔ جو بات بھی کہی گئی ہے نہایت متین، سنجیدہ اور اس کے ساتھ سلیس اور شگفتہ انداز سے کہی گئی ہے۔ "مذہبی دنیا" میں یہ خصوصیت مستحقِ تحسین ہوتی ہے ــــ درجنوں از خود رفتن کار ہر دیوانہ نیست ــــ ہم اس کتاب کی جلد دوم کا شدت سے انتظار کریں گے۔

آخر میں ہم مصنف کی خدمت میں ایک ضروری گزارش کرنا چاہتے ہیں، اور وہ یہ کہ وہ جب مسلمانوں

کے عقاید کے متعلق تحقیق کرنا چاہیں تو اس کے لئے قرآن کریم کی طرف رجوع کریں، نہ کہ روایات و تفاسیر کی طرف، کیونکہ ہماری کتب روایات و تفاسیر میں صحیح اور غلط مخلوط ہیں۔ اور ان کی صحت کا معیار و سند، قرآن کریم ہے جو ہر قسم کی آمیزش سے پاک ہے۔ زیر نظر کتاب میں انہوں نے بعض ایسی باتیں لکھ دی ہیں جو ہمارے ہاں (مسلمانوں میں) مروج تو ہیں لیکن قرآن کریم سے ان کی سند نہیں ملتی۔ ان کے مصادر، روایات ہیں حالانکہ روایات کے متعلق خود مصنف نے کہا ہے کہ "ان پر بحث و تنقید کی جا سکتی ہے کہ وہ کہاں تک حقیقت کے نزدیک ہیں اور کہاں تک ضعیف" (ص۲۰)

(٥)

۲۔ تحریکِ ختمِ نبوّت

از آغا شورش کاشمیری۔ (مرحوم)

ناشر۔ مطبوعات چٹان۔ لاہور۔ کتابت، طباعت صاف اور روشن۔ سفید کاغذ۔
ضخامت قریب اڑھائی سو صفحات۔ قیمت مجلد۔ پندرہ روپے۔

آغا شورش کاشمیری (مرحوم) کا تحریکِ ختم نبوت سے عمر بھر تعلق رہا۔ زندگی کے آخری حصہ میں (جو غیر متوقع طور پر جلدی ختم ہو گیا)، انہوں نے اس تحریک کی تاریخ مرتب کی جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی اور جو زیر تبصرہ کتاب کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ چونکہ (جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے) آغا مرحوم کا تحریک ختم نبوت سے عمر بھر ساتھ رہا، اس لئے اس تحریک کی زیر نظر تاریخ، جگ بیتی نہیں بلکہ ایک معنی میں خود ان کی آپ بیتی ہے جسے انہوں نے اپنے مخصوص ولولہ انگیز انداز میں تحریر کیا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو اس کتاب میں اس دور کی سیاسی تحریک بھی سمٹے ہوئے انداز میں آ گئی ہے، اور اس طرح اس میں درج شدہ معلومات کا دائرہ وسیع تر ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ کے مذہبی پہلو کے مقابلہ میں اس کا سیاسی پہلو، آغا (مرحوم) کے قریب تر رہا تھا۔ اس لئے زیر نظر کتاب میں بھی اس کے مذہبی پہلو کے متعلق گفتگو نہیں کی گئی۔ کتاب بہرحال بڑی دلچسپ ہے، اور صوری اعتبار سے بھی مطبوعات چٹان میں ایک عمدہ اضافہ۔

(٥)

پرویز صاحب کی معرکہ آراء انگریزی کتاب

ISLAM: A CHALLENGE TO RELIGION

جس نے اپنے ملک کے علاوہ یورپ اور امریکہ کے ارباب فکر و نظر سے بھی خراج تحسین حاصل کیا ہے۔

قیمت ــــ پیپر بورڈ ۔ ۲۰/- روپے ۔ قیمت۔ خوبصورت جلد کے ساتھ ۔ ۳۵/- روپے

محصول ڈاک اور پیکنگ علاوہ ــــ جلد حاصل کیجئے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی گلبرگ لاہور ۔ مکتبۂ دین و دانش، چوک اردو بازار لاہور

حقائق و عبر

۱۔ قرآن کے نام سے سرمایہ داری کی تبلیغ

لاہور میں خدام القرآن کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی ہے جس کے سربراہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی قرآنِ کریم کی تبلیغ کے لیے وقف کر دی ہے۔ ان کا یہ اقدام بڑا مبارک اور مسعود ہے لیکن اصل سوال یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم کس قسم کی پیش کی جاتی ہے۔ پچھلے دنوں (مارچ ۱۹۷۶ء میں) لاہور میں اس انجمن کی تیسری سالانہ قرآن کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں مختلف اربابِ علم نے اپنے مقالات پیش کیے۔ ان میں سے ایک مقالہ پمفلٹ کی شکل میں ہم تک پہنچا ہے۔ مقالہ کا عنوان ہے "قرآنِ حکیم کا تصورِ ملکیت" مقالہ نگار ہیں مولانا محمد طاسین صاحب۔ ناظم مجلس علمی کراچی۔ اس مقالہ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:۔

> الہامی ہوں یا غیر الہامی، دینی ہوں یا لادینی، قدیم ہوں یا جدید، ہر دستور و آئین اور ہر ضابطہ قوانین اور نظامِ شریعت میں بطور ایک انسانی حق کے شخصی ملکیت کا ذکر ضرور ملتا ہے..... ادارہ اقوامِ متحدہ جو آج اقوامِ عالم اور پوری انسانیت کا سب سے بڑا نمائندہ ادارہ ہے جس کے ممبر ہر مکتبِ خیال کے انسان ہیں..... اس کا بنیادی انسانی حقوق سے متعلق جو منشور ہے اس میں فرد کی شخصی ملکیت کا نہایت واضح الفاظ میں اقرار و اعلان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شخصی ملکیت کے جواز پر پوری انسانیت کا اتفاق و اجماع ہے۔ گویا یہ اُن مسلمہ اقدار اور عالمگیر صداقتوں میں سے ایک ہے جن کو انسانیت نے ہمیشہ اچھی نظر سے دیکھا اور قابلِ احترام سمجھا، اور ان فطری حقیقتوں میں سے ایک ہے جس کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی گئی اور انسانی فطرت کبھی ان سے مستغنی نہ ہو سکی۔

اس کے بعد مولانا صاحب ارشاد فرماتے ہیں:۔

شخصی ملکیت نہ ہوتو افراد اپنی ضرورت سے زیادہ مال و دولت کمانے کے لئے محنت و مشقت اور جد وجہد نہیں کر سکتے، جس کی معاشرے کو ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ شخصی ملکیت نہ ہوتی تو انسانوں اور عام حیوانوں کی طرز زندگی میں کچھ خاص فرق نہ ہوتا۔

(معاشیات ص ۱۳)

ممکن ہے اس سے یہ سمجھا جائے کہ شخصی ملکیت سے مولانا کی مراد انسان کی ذاتی استعمال کی چیزیں ہیں لیکن نہیں۔ انہوں نے اس کی خود ہی وضاحت کر دی ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

آخر میں مسئلہ ملکیت کے تیسرے پہلو کو لیجئے یعنی یہ کہ قرآن کریم جس شخصی ملکیت کا قائل ہے کیا اس کا دائرہ صرف اشیائے صرف اور ذاتی استعمال کی چیزوں تک محدود ہے یا ذرائع پیداوار بھی اس میں شامل ہیں۔ اس کے متعلق جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں، وہ یہ ہے کہ...... جس طرح کوئی شخص اشیائے صرف اور نجی استعمال کی چیزوں کا مالک قرار پاتا ہے۔ اسی طرح پیداوار اور وسائل آمدنی کا بھی مالک قرار پا سکتا ہے۔

(ص ۲۲)

مولانا صاحب نے اس کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ ذرائع پیداوار میں زمین اور کارخانے سب شامل ہیں۔

یہ ہے وہ تعلیم جسے قرآن کریم کے نام سے عام کیا جا رہا ہے۔ امت کی کس قدر بدنصیبی ہے کہ صدیوں کے بعد رجعت الی القرآن کا تصور پیدا ہوا ہے تو قرآن کریم کے نام سے تعلیم یہ پیش کی جا رہی ہے! اور نام اس کا رکھا جاتا ہے قرآن کی خدمت!!

۲۔ مکّے مدینے سے آواز آتی ہے

پچھلے دنوں شیخ عبدالعزیز صالح مسجد نبوی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے امام اور وہاں کے چیف جسٹس پاکستان تشریف لائے۔ مسلمانان پاکستان نے جس جذب و شوق اور احترام و عقیدت سے ان کا استقبال کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ کراچی پہنچنے پر ان کا ایک انٹرویو لیا گیا جو لائل پور سے شائع ہونے والے "المنبر ڈائجسٹ" کی ۱۵ فروری ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ان سے سوال کیا گیا کہ مسلم نوجوانوں میں مذہب سے بے گانگی ہر جگہ بڑھتی جا رہی ہے۔ آپ کے خیال میں اس کا انسداد کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ:-

یہ صورت حال دشمنانِ اسلام کی اُن کوششوں کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کے مذہب سے دور کرنے کے لئے اول تو اُن کے دلوں میں اسلام کی حقانیت کے بارے میں شکوک پیدا کئے جائیں۔ پھر انہیں ایسا بنا دیا جائے کہ وہ نام کے مسلمان رہ جائیں۔ (صفحہ ۳۱)

اس کے بعد دیکھئے کہ اسلام کی صداقت اور حقانیت کو نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دلوں میں راسخ کرنے کے لئے انہیں کس قسم کی تعلیم دی جانی چاہیئے۔ اس کے لئے مندرجہ ذیل سوال اور جواب پر غور کیجئے:-

سوال:- معاف کیجئے! اکثر کہا جاتا ہے کہ چوری، لوٹ مار وغیرہ کا سبب معاشرہ میں لوگوں کے درمیان اقتصادی اور معاشی تفاوت ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟
(صفحہ ۳۲)

سوال آپ نے سن لیا۔ اب جواب ملاحظہ فرمائیے۔

یہ بات وہ لوگ کہتے ہیں جن کا نہ خدا پر اعتقاد ہے اور نہ قیامت پر یقین رکھتے ہیں۔ جو ایمان کی شیرینی سے ناآشنا ہیں وہ خدا سے پھر گئے ہیں۔ اللہ نے ان سے منہ پھیر لیا ہے۔ جہاں تک مومن کا تعلق ہے اُس کا ایمان ہے کہ جو کچھ دیتا ہے اللہ دیتا ہے۔ آمدنی قلیل ہو یا کثیر، اس پر قناعت کرتے ہوئے اپنی ضرورت کے لئے اللہ سے مانگتا ہے۔ کبھی دعا جلدی قبول نہ بھی ہو تو مایوس نہیں ہوتا۔ اس کا دل اللہ پر اعتماد کی دولت سے غنی ہوتا ہے۔ جو لوگ اللہ پر بھروسہ نہیں رکھتے وہ صراط مستقیم سے بھٹکے ہوئے ہیں اور فساد کا سبب ہیں۔
(صفحہ ۳۲)

یہ ہے وہ وعظ جس سے امام موصوف کے نزدیک مسلمان نوجوانوں کے دل میں اسلام کی حقانیت راسخ ہو جائے گی، اور دشمنانِ اسلام کی کوششیں ناکام رہ جائیں گی۔ سچ کہا تھا کہ حکیم الامت نے کہ:-

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا، خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

(۰)

۳- سب خوش رہیں

حال ہی میں اسلامک کونسل آف یورپ کی طرف سے لندن میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی ہے جس میں ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی طرف سے بھی ایک مقالہ پیش کیا گیا ہے۔ جس کا

عنوان ہے "اسلام کس چیز کا علمبردار ہے" اور جو ان کے ماہنامہ "ترجمان القرآن" کی اشاعت بابت اپریل ۱۹۷۶ء میں چھپا ہے، اس میں مودودی صاحب فرماتے ہیں :۔

دنیا میں ایک قسم کی چیزیں وہ ہیں جنہیں ہم اپنے حواس کے ذریعے سے محسوس کر سکتے ہیں، یا اپنے فنی آلات سے کام لے کر ان کا ادراک کر سکتے ہیں۔ اور ان ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کو مشاہدات، تجربات اور فکر و استدلال کی مدد سے مرتب کر کے نئے نئے نتائج تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس نوعیت کی اشیاء کا علم خدا کی طرف سے آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہماری اپنی تلاش و جستجو، غور و فکر اور تحقیق و اکتشاف کا دائرہ ہے۔ (صـ۲۵)

یہاں مودودی صاحب نے صاف اور واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ اشیائے کائنات کے متعلق علم، انسان کے اپنے غور و فکر اور تحقیق و اکتشاف کی رو سے حاصل ہوتا ہے۔ اس علم کو "خدا کی طرف سے آنے کی کوئی ضرورت نہیں"۔ اس مقام پر مودودی صاحب ایک ماڈرن سائنٹسٹ کے انداز سے گفتگو کر رہے ہیں اور صحیح بات کہہ رہے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ، اس سے متصل باقی عبارت ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں :۔

یہ ہماری اپنی تلاش و جستجو، غور و فکر اور تحقیق و اکتشاف کا دائرہ ہے اگرچہ اس معاملے میں بھی ہمارے خالق نے ہمارا ساتھ بالکل چھوڑ نہیں دیا۔ تاریخ کے دوران میں وہ غیر محسوس طریقے سے ایک تدریج کے ساتھ اپنی پیدا کی ہوئی دنیا سے ہمارا تعارف کراتا رہا ہے۔ علم و واقفیت کے دروازے کھولتا رہا ہے۔ اور وقتاً فوقتاً الہامی طور پر کسی نہ کسی انسان کو ایسی کوئی بات سجھاتا رہا ہے جس سے وہ کوئی نئی ایجاد یا کوئی نیا قانونِ فطرت دریافت کرنے پر قادر ہو سکا ہے۔ لیکن فی الجملہ ہے یہ انسانی علم ہی کا دائرہ .... جس کے لئے خدا کی طرف سے کسی نبی اور کتاب کے آنے کی حاجت نہیں ہے۔ اس دائرے میں جو معلومات مطلوب ہیں انہیں حاصل کرنے کے لئے ذرائع انسان کو دے دیئے گئے ہیں۔ (صـ۲۵)

یعنی ایک ہی سانس میں کہا یہ جا رہا ہے کہ :۔

۱۔ اشیائے کائنات کا علم خدا کی طرف سے آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

۲۔ خدا وقتاً فوقتاً الہامی طور پر، کسی نہ کسی انسان کو ایسا علم دیتا رہا ہے (یعنی اس کی ضرورت تو کوئی نہیں تھی، اس کے باوجود وہ ایسا کرتا رہا ہے۔ کیا کہنے ہیں ایسے خدا کے جو معاذ اللہ، بلا ضرورت ایسے اقدامات کرتا ہے

اور اس کے باوجود

۳۔ ہے یہ انسانی علم ہی کا دائرہ جسے حاصل کرنے کے لئے ذرائع انسان کو دے دیئے گئے ہیں۔

آپ سوچئے کہ دس سطروں کی اس عبارت میں کس قدر متضاد باتیں کہی گئی ہیں۔ اور انہیں پیش کیا گیا ہے اسلامی تعلیم کے نام سے اس اجتماع میں جس میں دنیا بھر کے سائنس دان اور مفکرین گوش برآواز ہوں گے۔ آپ سوچئے کہ دنیا کے ارباب علم و فکر کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے اس سے بڑی کسی سازش کی ضرورت ہے؟ لیکن لطف یہ ہے کہ مودودی صاحب کے مصاحبین ان کی اس تحقیقِ انیق کو بھی انسانی فکر کا شاہکار قرار دیں گے۔

(۰)

۴۔ اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے۔

برسوں پہلے پرویز صاحب نے قرآن کریم کے معاشی نظام کی اصل و بنیاد ان تین قرآنی اصولوں کی روشنی میں پیش کی :-

(۱) تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر لی ہے۔

(۲) خدا کی یہ ذمہ داری اس نظام (اسلامی مملکت) کے ہاتھوں سے پوری ہوتی ہے جو اس کے قوانین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے قائم ہوتا ہے — اور

(۳) یہ نظام اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو نہیں سکتا جب تک ذرائع رزق اس کی تحویل میں نہ ہوں۔

اس پر ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے قیامت برپا کر دی گئی۔ پکڑیو۔ لیجیو۔ جانے نہ پائے۔ یہ ملحد ہے، بے دین ہے اور نہ معلوم کیا کیا ہے۔ پرویز صاحب مخالفتوں کے اس ہجوم کے علی الرغم قرآن کی اس آواز کو مسلسل بلند کرتے رہے۔ اس یقین کے ساتھ کہ ایک دن آئے گا جب یہ مخالفتیں چھٹ جائیں گی اور زمانے کے تقاضے ان حضرات کو مجبور کر دیں گے کہ وہ اس کی تائید کریں۔ ان کے اس یقین کا عملی ثبوت ہمیں حال ہی میں ملا ہے۔ لندن میں ورلڈ آف اسلام فسٹیول کا اجتماع جاری ہے۔ اس میں پاکستانی وفد کی قیادت، مملکتِ پاکستان کے امورِ مذہبیہ کے وزیر، کوثر نیازی صاحب کے حصے میں آئی ہے۔ انہوں نے اس اجتماع میں "اسلام میں اقتصادیات کا تصور" کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کیا ہے جس کی قسطِ اول راولپنڈی کے روزنامہ "نیوٹائمز" کی ۱۱ اپریل ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے۔ نیازی صاحب اس میں قرآن کی رو سے، دولت جمع کرنے کو ناجائز قرار دینے کے بعد، فرماتے ہیں کہ قرآن کے معاشی نظام کے اساسی اصول حسب ذیل ہیں۔

قرآن کریم صاف اور بیّن الفاظ میں اس کی وضاحت کرتا ہے کہ سامانِ زلیت
کو جو انسانی معاشرہ کی بنیادی ضرورت ہے، معاشرہ کے کسی خاص طبقے کے
سپرد نہیں کیا جا سکتا کہ دوسرے طبقات اپنی روٹی کے لئے ان کے دست نگر
ہوں۔ یہ خدائے تعالیٰ کی ذمہ داری ہے۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

خدا کی اس ذمہ داری کے متعلق یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ جس کی قسمت میں جو کچھ
لکھا ہے اُسے وہی اور اتنا ہی مل سکتا ہے۔ خدا کی یہ ذمہ داری اس نظام
کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے جو قوانینِ خداوندی کو عملاً نافذ کرنے کے لئے قائم
ہوتا ہے۔ (اس پر مقالہ کی قسط اول اختتام پذیر ہوتی ہے)

آپ نے غور فرمایا کہ "ملحد، بے دین، مرتد" پرویز کی یہ آواز کہاں سے بلند ہوتی ہے اور اسے کون
بلند کرتا ہے؟ یہ بلند ہوتی ہے مملکتِ پاکستان کے مذہبی امور کے وزیر کی طرف سے اس اجتماع
میں جس میں دنیا بھر کے مسلم ممالک کے اربابِ فکر و نظر شریک ہیں۔

اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے

فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

(۰)

۵- اب خدا کی باری آئی!

ان صفحات میں متعدد بار لکھا جا چکا ہے کہ مودودی صاحب کا مشن یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم
کا اسلام پیش کیا جائے جس سے ہمارا سوچ بچار کرنے والا نوجوان طبقہ اسلام کا لبادہ اتار کر پھینک
دے اور جس کا دنیا کے اربابِ فکر و نظر مذاق اڑائیں۔ اس سلسلے میں ہم ان کی طرف سے پیش کردہ متعدد
تصورات اور عقاید سامنے لا چکے ہیں۔ اس وقت یہ دیکھئے کہ وہ خدا کے متعلق کیا تصور پیش کرتے
ہیں۔ جماعتِ اسلامی کے ترجمان "ایشیا" کی ۴ر اپریل ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں مودودی صاحب کا
درسِ قرآن شائع ہوا ہے (جو غالباً آن کی تفسیر سے لیا گیا ہے)۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:-

قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی رضا میں بہت بڑا فرق
ہے جس کو نظر انداز کر دینے سے بالعموم شدید غلط فہمیاں واقع ہوتی ہیں۔
کسی چیز کا اللہ کی مشیت اور اس کے اذن کے تحت رونما ہونا لازمی طور پر
یہ معنے نہیں رکھتا کہ اللہ اس سے راضی بھی ہے اور اسے پسند بھی کرتا ہے۔
دنیا میں کوئی واقعہ کبھی صدور میں نہیں آتا جب تک اللہ اُس کے صدور کا

اذن نہ دے ...... کسی چور کی چوری، کسی قاتل کا قتل، کسی ظالم و مفسد کا ظلم و فساد اور کسی کافر و مشرک کا کفر و شرک، اللہ کی مشیت کے بغیر ممکن نہیں ...... مگر اس قسم کے واقعات سے اللہ راضی نہیں ہے۔

اس سے (معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ) بیچارے اللہ میاں کی مجبوری کا اندازہ لگائیے۔ وہ ایک واقعہ کے صادر ہونے کا حکم دیتا ہے۔ درآں حالیکہ وہ اس سے خوش نہیں۔ ظاہر ہے کہ اسے یہ تلخ گھونٹ بہ امر مجبوری پینا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر اسے یوں سمجھئے کہ کوئی تھانیدار اپنے ماتحت سپاہی سے کہے کہ فلاں بے گناہ کو گرفتار کر کے الٹا لٹکا دو۔ وہ سپاہی کہے کہ حضور آپ جانتے ہیں کہ وہ بے گناہ ہے پھر آپ مجھے ایسا کرنے کا حکم کیوں دے رہے ہیں۔ اس کے جواب میں تھانیدار صاحب کہتے ہیں کہ بھائی! میں بھی جانتا ہوں کہ وہ بے گناہ ہے۔ لیکن میں یہ حکم چاؤ سے نہیں دے رہا۔ میں مجبور ہوں۔ مجھے اوپر سے ایسا ہی کہا گیا ہے۔ آپ سوچئے کہ مودودی صاحب کے پیش کردہ خدا کی کیفیت بھی (معاذ اللہ) کچھ ایسی ہی نہیں؟ وہ ایسے احکام نافذ کرنے پر مجبور ہوتا ہے جنہیں وہ ناپسند کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود اسے وہ احکام صادر کرنے پڑتے ہیں۔ توبہ توبہ۔ معاذ اللہ۔ ہمیں افسوس مودودی صاحب پر نہیں، بصد افسوس ان کے ان معتقدین پر ہے جو ان کی اس قسم کی مزخرفات پر بھی تحسین و آفرین کے نعرے بلند کرتے ہیں۔ اندھی عقیدت کس طرح انسانوں سے فکر و بصیرت کی صلاحیتیں چھین لیتی ہے، لیکن جس قوم سے میرزا غلام احمد جیسوں کو معتقدین کی کھیپ مل سکتی ہے اس سے مودودی صاحب کو متبعین مل جانا کون سی تعجب کی بات ہے؟

(○)

ضرورت رشتہ

(۱) میٹرک۔ پی۔ ٹی۔ سی۔ امورِ خانہ داری و سلائی کڑھائی کی ماہر، اکیس (۲۱) سالہ دوشیزہ کے لئے موزوں باروزگار رشتہ درکار ہے۔

خط و کتابت (بصیغۂ راز)۔ ا۔ ل۔ معرفت *

(۲) پانچویں جماعت پاس۔ سلائی، کڑھائی و دستکاری کی سند یافتہ تیئس (۲۳) سالہ دوشیزہ کیلئے موزوں، بارو‌زگار رشتہ درکار ہے۔

خط و کتابت (بصیغۂ راز)۔ ا۔ ب۔ معرفت *

(نوٹ) پیشتر یہ اشتہار مارچ ۱۹۷۶ء کے شمارے میں صفحہ ۵۸ پر شائع ہوا تھا اور دورانِ ماہ "ا۔ل"، "ا۔ب" کے نام آمدہ چٹھیاں ماہ کے آخر میں دونوں پارٹیوں کو اکٹھی ارسال کرنی تھیں۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ سب چٹھیاں ڈاک سمیت ۲۷ مارچ کو بریف کیس کی چوری کے ایک حادثہ میں ضائع ہو گئیں۔ لہٰذا یہ اشتہار اس توضیح کے ساتھ دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے تاکہ جن احباب نے پیشتر اپنے کوائف بھیجے ہوں وہ صورت حال معلوم ہونے پر دوبارہ رجوع کریں۔

* ناظم ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور

طلوعِ اسلام کا رسالہ و لٹریچر مندرجہ ذیل پتوں سے بھی دستیاب ہو سکتا ہے!

۱۔ صدیقیہ اخبار ایجنسی (?) گکس۔ بنک روڈ۔ مردان
۲۔ امیر احمد بک ایجنسی۔ بکٹ گنج ،،
۳۔ شمع بک ایجنسی متصل دفتر میونسپل کمیٹی ،،
۴۔ پنجاب بک ڈپو۔ فوارہ چوک۔ راجہ بازار۔ راولپنڈی شہر۔
۵۔ اعظم بک ڈپو ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،،
۶۔ بک سنٹر نزد سیروز سینما۔ راولپنڈی صدر
۷۔ بک سٹال۔ اڈہ گورنمنٹ بس سروس۔ آبپارہ۔ اسلام آباد۔
۸۔ مسلم جنرل سٹور مین بازار جلالپور جٹاں۔
۹۔ ملک اینڈ سنز۔ سیالکوٹ۔
۱۰۔ گوشۂ ادب۔ جناح روڈ۔ کوئٹہ
۱۱۔ انصاری بکسٹال پرنس روڈ۔ ،،
۱۲۔ نگار بک سٹال ،، ،، ،,
۱۳۔ کارواں بک سنٹر۔ شاپنگ سنٹر۔ ملتان صدر
۱۴۔ ریلوے بک سٹال۔ اسٹیشن۔ ملتان چھاؤنی۔
۱۵۔ عزیز بک سٹال۔ چوک حرم گیٹ۔ ملتان۔
۱۶۔ ناز بک سٹال۔ چوک ڈیرہ اڈہ۔ ،،
۱۷۔ شاہ سنز۔ پاک گیٹ۔ فون ۲۰۷/۵۷۱ (?)۔ ملتان
۱۸۔ اقبال بک ہاؤس۔ ٹرام جنکشن۔ صدر کراچی
۱۹۔ اقبال بک ڈپو۔ بوہری بازار۔ ،، ،،
۲۰۔ نسیم نیوز پیپر ایجنسی۔ شاہراہِ عراق ،، ،،
۲۱۔ ماڈرن بکسٹال۔ مقابل ایمپریس مارکیٹ ،، ،،
۲۲۔ ایس۔ اے۔ پی نیوز ایجنسی۔ (ریگل بس سٹاپ) ،، ،،
۲۳۔ طاہر بک سنٹر۔ نزد ٹرام جنکشن ،، ،،
۲۴۔ کیپٹل نیوز کارنر۔ نیو کیپٹل سینما ،، ،،
۲۵۔ قادر بک سٹال میری ویدر ٹاور۔ ایم اے جناح روڈ کراچی

۲۶۔ لائٹ آف پاکستان۔ کارنر پرنس روڈ۔ کراچی
۲۷۔ لائٹ ہاؤس بک سٹال کارنر سبحان اللہ ہوٹل جناح روڈ ،،
۲۸۔ نواب نیوز ایجنسی۔ بہار کالونی۔ بس سٹینڈ۔ ،،
۲۹۔ سردار محمد نیوز ایجنسی حیدرآباد کالونی بس سٹاپ ،،
۳۰۔ عوامی بک ڈپو۔ بولٹن مارکیٹ۔ جناح روڈ۔ ،،
۳۱۔ میگزین سٹال۔ چورنگی نمبر ۱ لیاقت آباد۔ ،،
۳۲۔ محمد دین بکسٹال۔ نزد ڈاک خانہ ،، ،،
۳۳۔ رجب علی بکسٹال۔ طارق روڈ (OPP. UBL) PECHS. ،،
۳۴۔ ظفر بک سٹال۔ مقابل کیفے لبرٹی ،، ،،
۳۵۔ اقبال بکسٹال علامہ اقبال روڈ۔ کمرشل ایریا ،، ،،
۳۶۔ اسلم نیوز پیپر ایجنسی۔ مقابل نیو پریسٹن ہوٹل بہادر آباد۔ چورنگی ،، ،،
۳۷۔ محمد یامین بکسٹال۔ ناظم جناح روڈ۔ کنٹونمنٹ ،،
۳۸۔ محمد بشیر بکسٹال ،، ،، ،، ،، ،,
۳۹۔ ولی محمد بک سٹال۔ دامسوامی ٹاور ،،
۴۰۔ حاجی بک سٹال۔ جونا مارکیٹ ،،
۴۱۔ جدید بک ڈپو۔ مین روڈ بازار۔ ڈرگ کالونی ،،
۴۲۔ امتیاز بک ڈپو ،، ،، ،، ،، ،, ،،
۴۳۔ اسلامک نیوز ایجنسی الفلاح سوسائٹی نزد سینما ،، ،،
۴۴۔ احتشام الحق بکسٹال نیوز پیپر سروس ،، ،، ،،
۴۵۔ موری بکسٹال شاہراہ لیاقت علی خان ،، ،، ،،
۴۶۔ سٹی بک سٹال ،، ،، ،، ،، ،،
۴۷۔ نہال بک سٹال ،، ،، ،، ،،
۴۸۔ غلام مصطفےٰ بک سٹال۔ ناظم آباد ۲ ،،

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ لاہور

حیاتِ قائدِ اعظمؒ کے نمایاں خط و خال

(۴)

[اس سلسلۃ الذہب کی تیسری کڑی، طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی جس میں تحریکِ پاکستان کے پس منظر پر سیر حاصل گفتگو کی گئی تھی۔ اب اس کی اگلی کڑی پیشِ خدمت ہے]

حیاتِ قائد کے نشیب و فراز اور تحریکِ پاکستان کے پس منظر سے آگے بڑھتے ہوئے اب ہم براہِ راست اس نشانِ منزل تک آپہنچے ہیں جہاں سے ہماری ملت کا کاروانِ شوق تحریکِ پاکستان کے کارزاروں میں داخل ہوتا ہے۔ ایک جداگانہ قوم اور اس کے لئے جداگانہ مملکت کا مطالبہ ——— یہ تھی وہ عظیم معرکہ آرائی جو تحریکِ پاکستان کے نام سے مارچ ۱۹۴۰ء میں شروع ہوئی اور اگست ۱۹۴۷ء میں اس حسن کارانہ انداز سے حاصل تکمیل کو پہنچی جس کی مثال صدیوں سے ہماری تاریخ میں موجود نہ تھی۔ قائدِ اعظم کی مایہ ناز قیادت اور حسنِ تدبر کا یہ کس قدر عظیم شاہکار تھا کہ وہ قوم جو چند سال قبل اپنے مسلسل زوال اور انتشار کے باعث غولِ بیابانی سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی ایک واضح نصب العین کا سہارا لے کر دیکھتے ہی دیکھتے اس انقلابِ حیات کی فاتح قرار پا گئی جس نے سیاسیاتِ عالم کے نقشے بدل کر رکھ دیئے اور عالمِ اسلام کی تاریخ کو ایک فردوسِ گم گشتہ کی بازآفرینیوں سے ہم آغوش کر دیا۔

ایک اہم پیش گوئی

اپنے طویل دورۂ ہند کے خاتمہ پر شہرۂ آفاق صحافی بیورلی نکلس نے ۱۹۴۳ء میں بڑی اہم پیشگوئی کی تھی۔ اور آج سوچئے کہ کس قدر حقیقت بردوش تھی یہ پیش گوئی جس میں اس نے بڑے ہی صاف اور واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ:

اس بات کا بہت قوی امکان ہے کہ (پاکستان کی) یہ خیالی سلطنت ایک دن اچانک طور پر وجود پذیر ہو کر دنیا کے نقشے میں ابھر آئے۔ میں بذاتِ خود ان لوگوں میں سے ہوں جو نہ صرف یہ یقین رکھتے ہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا بلکہ یہ بھی کہ ایسا ضرور بالضرور ہونا چاہیئے۔ جب بھی ایسا ہوا ایشیا میں قطعاً "نئے حالات رونما ہونگے

جن کی بدولت موجودہ توازنِ قوت پارہ پارہ ہو جائے گا اور دنیا کے ہر ملک کو اپنی پالیسی بدلنی پڑے گی۔
(VERDICT ON INDIA)

اور اگر غور کیجئے تو یہ پیش گوئی درحقیقت ترجمانِ حقیقت علامہ اقبالؒ کے اس حقیقت کشا اعلان کی روشنی میں تھی۔ جس کا اظہار کرتے ہوئے اس مردِ قلندر نے اس سے بھی تیرہ سال قبل پورے یقین اور مومنانہ اعتماد سے خطبۂ الہ آباد میں فرمایا تھا۔

مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقے کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔

اوائل ۱۹۴۰ء تک ہماری ملت کے اجتماعی شعور نے سیاسیات ہند کی جولانگاہ میں جو ارتقائی مراحل طے کئے۔ وہ اس حقیقت ثابتہ کے آئینہ دار تھے کہ بحیثیت اجتماعیہ انسانیہ کے ہر اصول اور ہر نقطۂ نظر سے ہم قطعی طور پر الگ اور جداگانہ ملت کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس ملی تشخص کو کسی دوسری قومی یا سیاسی وحدت میں مدغم نہیں کیا جا سکتا۔ صدیوں کے قومی زوال اور شکست کے بعد اب وہ ساعتِ سعید تاریخ کے بابِ عالی پر دستک دے رہی تھی جب کہ نیشنلزم کے خداؤں اور جغرافیائی حدبندیوں میں جکڑی ہوئی اقوامِ عالم کو علی رؤس الاشہاد اس حقیقت سے روشناس کرایا جائے کہ آئیڈیالوجی کے اشتراک سے کیونکر ایک ملت کا وجود تشکیل پاتا ہے۔ اور اس کی اساس پر کس طرح ایک مملکت کا مطالبہ حاصلِ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں اقبال نے گنگ و جمن کے سنگم پر کھڑے ہو کر جن عالم آرا حقائق کی نقاب کشائی کی تھی۔ دس سال بعد دریائے راوی کی لہریں ابھر ابھر کر انہیں جناح کے ہاتھوں محسوس و مشہود پیکروں میں ڈھلتے دیکھ رہی تھیں۔ حسنِ تدبر کی جاں نوازیوں کا یہی شاہکار تھا جو ایک محکوم و مجبور قوم کی آزادی و استقلال کا ضامن قرار پا گیا۔ اور اسی کی بدولت محمد علی جناح کی گرانمایہ شخصیت ایک نقشِ دوام کی حیثیت سے جریدۂ عالم پر جلوہ بار رہے گی۔

منٹو پارک کا تاریخی اجتماع

دریائے راوی کے کنارے منٹو پارک کے سبزہ زاروں میں مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کا بے مثال قومی دربار دس کروڑ اسلامیانِ ہند کے اسی اجتماعی شعور کا عکسِ جمیل تھا۔ اس تاریخی اجتماع میں دس کروڑ اسلامیانِ ہند کی مرہونِ امنگیں اور عزائم ایک صاف اور واشگاف نصب العین میں مرکوز ہو گئے اور قرار دادِ لاہور ان کے مطلعِ تقدیر پر امید کے درخشندہ ستاروں کی طرح جگمگا اٹھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اس تاریخی اجلاس نے ابتلاء و آزمائش کی جن ہولناک پورشوں میں نشانِ منزل کا تعین کیا وہ بجائے خود ہماری تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش ورق ہے۔ اور یہی وہ نازک مرحلہ تھا جس کی بدولت قائدِ اعظم کی عظمتِ کردار ان کا حسنِ تدبر، ان کا عزمِ صمیم، سیاسی بصیرت اور قوتِ استقلال پوری آب و تاب سے نکھر کر نگاہوں کے سامنے آ گئے۔ یہی کچھ ان کی شہرہ آفاق کامرانیوں اور فائز المرامیوں کی ضمانت ثابت ہوا اور اسی سے اس حقیقت کا صحیح صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ ایک قائدِ اعظم کو کن محکم اور انقلاب آفریں اوصاف کا پیکر ہونا چاہیئے۔

ایک خونیں مرحلہ

اس اہم اجلاس سے صرف دو روز قبل لاہور میں حکومتِ پنجاب خاکساروں پر اندھا دھند فائرنگ کے ذریعے سرزمینِ لاہور میں وحشت و بربریت کے طوفان حرکت میں لا چکی تھی۔

قدم قدم پر ہتھکڑیوں کی جھنکار اور بیڑیوں کی نمائش نے اس ہنگامہ خیز شہر کے ہر گلی کوچے کی رونقوں کو خاموش قبرستانوں میں بدل دیا تھا۔ اور اس اجلاس کو ناکام بنانے کے لئے معدوا ناد شمنوں کی حماقتی سازشیں اپنا کام کر چکی تھیں۔ لیکن تدبیر اور عزم و فراست کی معجز نمائی سمجھئے کہ قائداعظم کے لاہور میں ورود کے ساتھ ہی سارا نقشہ بدل گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس وحشت ناک فضا میں آزادی و حریت کے نعرے گونج اٹھے اور حیات ملی کا افسردہ و مردہ شبستان نئی امنگوں اور عزائم کے چراغوں سے جگمگانے لگا۔ ابتلاء و آزمائش کی تند و تیز آندھیوں اور حوادث کی برق سامانیوں میں ملت کے سالارِ انقلاب نے جس بےمثال فراست سے قوم کا رخ آزادی و استقلال کی منزل کی طرف پھیر دیا اس کا حقیقی اندازہ اس روئیداد سے ہو سکے گا جو اپریل ۱۹۴۰ء کے طلوع اسلام نے انتہائی حسن ترتیب سے اجلاس کا نقشہ کھینچتے ہوئے پیش کی تھی۔ جی چاہتا ہے کہ اس تمام روئیداد کو یہاں من و عن شائع کر دیا جائے لیکن مضمون کی طوالت اس شدت سے عناں گیر ہے کہ ہم زیر نظر موضوع سے متعلق اس میں سے محض چند جھلکیاں پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

سالانہ اجلاس کا ملک گیر انتظار

ملت اسلامیہ ہندیہ کے اس تاریخی اور نمائندہ اجتماع کے انتظار میں ملک بھر میں افراد ملت کے جذبات و احساسات کی کیفیت کیا تھی۔ طلوع اسلام اس کا نقشہ پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> سرزمین پنجاب کا ذرہ ذرہ اُبھر اُبھر کر ۲۱۔ مارچ کے استقبال کے لئے ہمہ تن چشم بن رہا تھا۔ اسلامی ہند کے گوشے گوشے میں اس تقریب کی آمد آمد پر شب عید کا سماں بندھ رہا تھا۔ جگہ جگہ سے تیاریوں کی خاص اطلاعات موصول ہو رہی تھیں جو اس امر کی آئینہ دار تھیں کہ لاہور دس کروڑ فرزندانِ توحید کی نگاہوں کا مرکز جان افزا بن رہا ہے۔ غرضیکہ ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی تھی اور ہر دھڑکنے والا قلب محسوس کر رہا تھا کہ ہندوستان کے سمائے سیاست پر ایک آفتاب تازہ کے طلوع کے سامان ہو رہے ہیں۔
>
> (طلوع اسلام۔ اپریل ۱۹۴۰ء)

وحشت کا دور دورہ

اور پھر عین موقع پر یکایک وزیراعظم پنجاب نے آتش و خون کی بارش کر کے ٹرکر اور مارشل لاء کے نفاذ اور پکڑ دھکڑ کا سلسلہ دوبارہ شروع کر کے مسلم لیگ سے جس وفاداری کی ضمانت پیش کی اس کی بھی کیفیت سن لیجئے۔

> جلوس صدر مسلم لیگ سے عین دو روز قبل شام کے قریب یہ خبر آگ کی طرح اطراف و اکناف ہند میں پھیل گئی کہ لاہور میں خاکساروں پر گولی چلا دی گئی۔ شہر پر پولیس اور فوج کا اقتدار قائم ہو گیا۔ ساری آبادی پر بلا کا سناٹا چھا گیا۔ تمام شہر ماتم کدہ بن گیا۔ ہر شخص ہراساں۔ ہر فرد متوحش۔ نہ باپ کو بیٹے کی خبر۔ نہ بھائی کو بھائی کا علم۔ کاروبار بند۔ دل پژمردہ۔ ولولے افسردہ ہمتیں پست۔ اجلاس میں صرف ایک دن باقی رہ گیا۔ ہر شخص حیران کہ اب کیا ہو گا۔ ہر ایک پریشان کہ اب کیا بنے گا۔ صدر جلسہ دہلی میں۔ استقبالیہ کمیٹی لاہور میں۔ تار پر تار آ رہے ہیں۔ ٹیلیفون پر ٹیلیفون ہو رہا ہے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ جیسا کہ مسٹر جناح نے بعد میں بتایا انہیں مخلصانہ مشورہ دیا گیا تھا کہ اجلاس ملتوی کر دیا جائے۔ (ایضاً)

عظمتِ کردار کا نقش تابندہ

لاہور کی اس وحشت ناک فضا اور اطرافِ ہند میں اس کے مذکورہ اثرات سے بالاتر ہو کر قائداعظم نے جس عزم و اعتماد سے اپنا قدم آگے بڑھایا اس کی تفصیل بھی ملاحظہ فرمائیے:-

پریشانی اور وحشت کے یہ سامان ایک طرف اور وہ عزم و ہمت کا پیکر دوسری طرف۔ نامساعدت حالات کی تیز و تند موجیں اٹھتی ہیں اور روشنی کے اس بلند و محکم مینار سے ٹکرا کر خاسر و نامراد واپس لوٹ آتی ہیں۔ فی الحقیقت ایک اولوالعزم انسان کے امتحان کا اس سے زیادہ موقع کم ہی آیا ہوگا۔ استقلال اور تدبر کے اس مجسمہ نے یہ سب کچھ سنا اور دیکھا لیکن اپنے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہ آنے دی۔ کیونکہ وہ دیکھتا تھا کہ اگر ایسے نازک وقت میں اس کا پاؤں پھسل گیا تو مسلمانانِ ہند کے مستقبل کا آبگینۂ حیات اس کے ہاتھ سے گر کر چور چور ہو جائے گا۔ اس نے تمام پریشانیوں کے ہجوم کو جھٹک کر ایک طرف رکھ دیا اور اعلان کر دیا کہ لیگ کا اجلاس ہوگا اور اپنے معینہ نظام اوقات کے مطابق بلا رد و بدل ہوگا۔ البتہ اس حادثہ المناک کے پیشِ نظر کہ جس نے مسلمانانِ ہند کے طرب آگیں قلوب کو کاشانۂ حزن و ملال بنا دیا ہے جلوس نہیں نکالا جائے گا۔ اس اعلان کے تین گھنٹہ بعد یہ پیکرِ عزم و استقلال حسب انتظامات سابقہ، اسپیشل ٹرین کے ذریعے عازمِ لاہور ہو گیا (ایضاً)

فضا بدل گئی

لاہور پہنچ کر پرچم کشائی کی رسم ادا کرتے ہوئے قائداعظم نے قوم کو جو حیات آفرین پیغام دیا وہ اس ماتم کناں شہر میں صورِ اسرافیل بن کر گونجا اور جس فضا میں کچھ دیر پہلے موت کا سناٹا تھا اور وحشت سی برس رہی تھی اس میں زندگی کے ہنگامے ابھر آئے۔ طلوعِ اسلام کے الفاظ میں یہ انقلاب سامنے لائیے۔

سننے والوں نے محسوس کیا کہ یہ الفاظ ظلمت کدہ لاہور پہ نور کی کرنیں بن کر برسے۔ اور یاس و حزن کی وحشت ناک تاریکی کا دامن چاک کر کے چاروں طرف شعاعِ امید دوڑا دی۔ دلوں میں پھر سے حرکت محسوس ہوئی۔ نگاہوں میں از سرِ نو روشنی پیدا ہو گئی۔ افسردہ چہروں پر خونِ تازہ کے آثار نظر آنے لگے۔ در و دیوار سے زندگی کے نقوش پھر سے ابھر آئے۔ . . . . ہوا کا رخ بدل گیا اور اس خوف و ہراس کا ردِ عمل جس نے چار روز سے خطۂ لاہور کو وحشت کدہ بنا رکھا تھا پورے جوش و خروش کی صورت میں نمودار ہوا، مغموم دلوں کی وہ آتشِ خموش جو اتنے دنوں سے اندر ہی اندر سلگ رہی تھی پوری تاب و تابی سے بھڑک اٹھی۔ (ایضاً)

سالارِ انقلاب کا مقام بلند

جوش و خروش کی اس فضا میں جہاں منٹو پارک کا گوشہ گوشہ فلک بوس نعروں سے زلزلوں کا نشیمن بن رہا تھا - قائداعظم نے اپنی عظیم ذمہ داریوں کو جس حسنِ تدبر سے حاصلِ تکمیل تک پہنچایا اس کا ذکر بھی سنیئے:

اس ہنگامۂ بحث و جدل اور اس سیلابِ جوش و خروش میں مسٹر جناح نے جس ہمت - استقبال، عزم راسخ

ـلـه قائداعظم محمد علی جناح؛ سـلـه وزیراعظم پنجاب کی ساری سازش کا مقصد ہی یہ تھا۔

تدبر اور صلاحیت، ضبط و انضباط کا ثبوت دیا، آنے والا مورخ جب اسے دیکھے گا تو بلا تامل پکار اٹھے گا کہ فی الواقعہ "قائدِ اعظم" کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ مبارک ہے وہ قوم جسے ایسا رہبر فرزانہ مل جائے اور مستحقِ صد تحسین ہے وہ انسان جسے مبداء فیض کی کرم گستری سے یہ نعمتیں یوں فراواں نصیب ہو جائیں۔
(ایضاً)

اجلاس لاہور کی اہمیت — اجلاس لاہور کی تفصیلات پیش کرنے کے بعد طلوعِ اسلام نے لکھا تھا:۔

لاہور کا یہ اجلاس فی الحقیقت مسلمانانِ ہند کی ملی زندگی میں ایک تاریخی اجلاس تھا۔ وہ خوش نصیب انسان جنہوں نے اس اجلاس کو بچشمِ خویش دیکھا ہے، محسوس کریں گے کہ انہوں نے ان دنوں میں ایک قوم کی پوری تاریخ کو اپنے ساتھ چلتے پھرتے دیکھ لیا۔ (ایضاً)

راہِ نجات کی نشان دہی — پورے ہندوستان کی نگاہیں آل انڈیا مسلم لیگ کے اس تاریخی اجلاس پر مرکوز تھیں۔ وائسرائیگل لاج، وائٹ ہال، آنند بھون، وردھا آشرم سب منٹو پارک سے، زعیم اسلامیانِ ہند کا صدارتی اعلان سننے کے لئے ہمہ تن گوش تھے۔ ہماری قومی تاریخ کا عجیب مرحلہ تھا جب آتش و خون کے ہنگاموں، ہتھکڑیوں کی جھنکار اور تڑپتی ہوئی لاشوں کے طوفانی ماحول اور قیامت خیز جوش و خروش میں مسندِ صدارت سے قائد اعظم کی بھرپور آواز پنڈال میں گونجی۔ انہوں نے سب سے پہلے ایک عظیم قائد اور مدبر کی حیثیت سے ملکی صورت حال پر تبصرہ کیا اور پھر اپنے مخصوص پُراعتماد لہجے میں فرمایا:۔

ہندوستان میں مسئلہ کی اہمیت فرقہ وارانہ نہیں بلکہ یہ مسئلہ ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے اور اسی نقطۂ نظر سے اسے طے کیا جا سکتا ہے۔ جب تک اس اصولی اور بنیادی حقیقت کو پیشِ نظر نہیں رکھا جائے گا خواہ کسی قسم کا آئین بھی معرضِ عمل میں لایا جائے وہ تباہ کن نتائج پیدا کرے گا۔ اور نہ صرف مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کا محرک ثابت ہوگا بلکہ ہندوؤں اور انگریزوں کی بھی۔ برطانوی حکومت اگر سچے خلوص سے اس برصغیر کے باشندوں کی مسرت اور امن و اطمینان کی آرزومند ہے تو اس کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان کو خود مختار ریاستوں میں تقسیم کر کے ان دو قوموں کو اپنی اپنی جداگانہ راہ اختیار کرنے کا موقع دے۔ یہ ریاستیں کسی اعتبار سے باہمی تصادم کا شکار نہیں ہوں گی۔ بلکہ اس کے برعکس ایک قوم کا دوسری قوم پر سیاسی اور معاشرتی تسلط قائم کرنے کا حریفانہ جذبہ ختم ہو جائے گا اور بین الاقوامی معاہدوں کے ذریعے ان کے دوستانہ مراسم ترقی پذیر ہو سکیں گے۔

قائد اعظم کے خطبۂ صدارت کے بعد ملتِ اسلامیہ کے اسی عظیم اور نمائندہ قومی دربار میں وہ تاریخی قرارداد اپنے حقیقی الفاظ میں منظرِ عام پر آئی جسے دنیا کے سیاست میں پہلے "قراردادِ لاہور" کا نام دیا گیا اور ازاں بعد "پاکستان اسکیم" کے نام سے اس نے دس کروڑ اسلامیانِ ہند کے قومی عزائم کے مرکز و محور کا مقام حاصل کیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے سکوتِ نیم شبی میں (ایک بجے شب کے قریب) اس یادگار اجتماع میں آخری خطاب کے دوران

زعیمِ ملّت نے فرمایا:-

"آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس اسلامیانِ ہند کی تاریخ میں ایک اہم باب کا آغاز کرے گا۔ مسلم لیگ کا یہ اجلاس ہر اعتبار سے کامیاب ثابت ہوا ہے۔ اگر یہ واقعہ ناگہ پیش نہ آتا تو ایک عظیم الشان جلوس نکلتا اور اسلامیانِ لاہور کو اپنے ولولہ ہائے شوق اور گرم جوشیوں کے اظہار کا موقع مل جاتا۔ ان کے حریف اس اجلاس کو ہر نوع ناکام بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ لیکن انہیں نامراد اور خاسر و ناکام لوٹنا پڑا۔ اور یہ اجتماع شایانِ شان کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ میں خوش ہوں کہ ساری کارروائی پُرامن اور خاموش فضا میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ مسلمانوں کے لئے یہ ایک کڑی آزمائش کی گھڑی تھی۔ ان کا خون کھول رہا تھا۔ ان کی تیس جانیں تلف ہو گئی تھیں۔ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ لیکن ان حالات کے باوجود آپ نے ثابت کر دیا کہ مسلمان رنج و غم کے ہجوم میں بھی صبر و استقلال کا دامن نہیں چھوڑتا۔ آپ نے دنیا کو بتا دیا کہ لاکھوں کے اجتماع میں بھی آپ اپنے امور حسن و خوبی سے انجام دے سکتے ہیں۔ کسی قوم کے لئے اس سے بہتر سند اور کیا ہو سکتی ہے۔ مسلم لیگ کا سارا وقار اسلامیانِ پنجاب کے ہاتھ میں تھا اور میں انہیں بخلوصِ قلب ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔ انہوں نے میرے عزائم کو ایک نئی قوت عطا کی ہے تاکہ میں آپ کی خدمت کر سکوں۔"

شاہی مسجد کے سر بفلک میناروں کے سائے اور مرقدِ اقبالؒ کے دامن میں آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ سالانہ اجتماع دس کروڑ مسلمانوں کیلئے ایک نشانِ منزل لے کر آیا اور اس نے ایک آزاد اور خود مختار ملّت کی حیثیت سے ہماری آزادی و استقلال کی منزلِ مقصود متعین کر دی۔ "قرارداد لاہور" کا اعلان درحقیقت ان دس کروڑ اسلامیانِ ہند کے دلوں کی دھڑکنوں کا ترجمان تھا جو ایک طویل مدت سے غولِ بیابانی کی طرح زوال اور انتشار کی مختلف پگڈنڈیوں پر بھٹک رہے تھے۔ اور اب قائدِ اعظم کے حسنِ تدبر کی کرشمہ سازیوں نے انہیں فکر و نظر کی وہ ہم آہنگی عطا کر دی تھی جو ان کیلئے ایک جداگانہ مملکت کے قیام کی بشارتیں لئے آ رہی تھی۔ اقبالؒ کے "قلبِ مضطر کی بے تابیوں اور دیدۂ تر کی بے خوابیوں کا صلہ" ——— نہیں! بلکہ اس مردِ قلندر کے سہانے خوابوں کی تعبیر اب درخشندہ حقائق کی صورت میں منظرِ عام پر آ رہی تھی۔

اور دوسری طرف ——— ہماری نشاۃِ ثانیہ کے یہ روشن امکانات ہندو سامراج کے گھناؤنے منصوبوں اور مسموم سازشوں کی بساط کو زیر و زبر کئے جا رہے تھے۔ اجتماعِ لاہور کے اس انقلاب انگیز فیصلے نے گاندھی جی، سی۔ آر۔ اچاریہ، راجندر پرشاد اور پنڈت نہرو جیسے چوٹی کے ہندو لیڈروں کو بوکھلا کر رکھ دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مخالفانہ پروپیگنڈے کے ذلیل حربے حرکت میں آ گئے۔ ہندو پریس غم و غصہ کی دیوانگی میں بہتان طرازیوں اور افترا پردازیوں کی انتہا تک پہنچ گیا۔ ذمہ دار کانگرسی رہنماؤں کے اخباری بیانات اشتعال انگیزی اور غیر ذمہ داری کے نئے ریکارڈ قائم کرنے پر اتر آئے۔

عصائے موسوی حرکت میں

قائدِ اعظمؒ نے یہ سب کچھ خاموشی سے سنا اور ایک عظیم ملّت کے کامیاب و کامران قائد کی حیثیت سے اسے صبر و ضبط سے برداشت کیا اور پھر

جب محسوس کیا کہ جواب دینے کا وقت آگیا ... تو ان کی حقیقت آفریں قوتِ استدلال عصائے موسوی کی کی طرح ان رسیوں کو نگلنے کے لئے آگے بڑھی۔ تمام الزام بازیوں کے پرخچے اڑاتے ہوئے انہوں نے اپنے اخباری بیان میں حقیقت پسند دنیا کو یوں مخاطب کیا:۔

میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ بیگانگی اور ناگوار ماحول جو ایک گروہ کے دوسرے گروہ پر اقتدار حاصل کرنے اور زیر تسلط لانے کی آرزوؤں کی پیداوار ہے۔ جب ختم ہو جائے گا تو ایک خوش گوار افہام و تفہیم اور خیر سگالی کی فضا پیدا ہو جائے گی۔ ملک کی تقسیم متعلقہ منطقوں کی اکثریتوں کو ذمہ داری کا یہ احساس دلائے گی کہ وہ اقلیتوں میں اپنے "تحفظ" کا سچا یقین پیدا کریں اور ان کا مکمل اطمینان اور اعتماد حاصل کریں۔

SPEECHES AND WRITINGS OF MR. JINNAH, VOL. I - P. 148)

مسٹر راجگوپال اچاریہ کے ایک بیان کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا:۔

یقیناً سارا ہندوستان کانگرس کی ملکیت نہیں۔ اور اگر آپ اس کی حقیقی ماں کو پوچھتے ہوں تو وہ دراوڑی ہے۔ اور اس سے بھی آگے بڑھئے تو وہ قدیم ترین جنگلی باشندے ہیں۔ وہ نہ تو آریائی تھے اور نہ مسلمان۔ ہندوستان سے متعلق آریاؤں کے دعاوی مسلمانوں سے قوی نہیں سوائے اس کے کہ وہ ایک خاص وقت پر ان سے پہلے آئے تھے ...... مسٹر راجگوپال آچاریہ کے بیان اور قرار داد لاہور پر ان کی تنقید سے واضح ہوتا ہے کہ وہ قوائے عقلی سے "قطعاً" محروم ہو چکے ہیں (ایضاً صفحہ ۱۸۱)

۲۷ مئی ۱۹۴۵ء کو بمبئی پراونشل مسلم لیگ کانفرنس کے نام ایک پیغام میں انہوں نے اپنی ملت پر واضح کیا کہ:۔

آل انڈیا مسلم لیگ نے اسلامیانِ ہند کی صحیح طور پر رہنمائی کی ہے۔ اس نے انہیں ایک پرچم، ایک پلیٹ فارم، ایک پالیسی اور ایک متعین لائحہ عمل عطا کیا ہے اور بالآخر اس نے قرار داد لاہور کے ذریعے مسلم ہندوستان کے لئے منزلِ مقصود اور نصب العین کی نشاندہی کر دی تاکہ وہ اس کے لئے سرگرم پیکار رہے اور ہر ممکن قربانی سے اسے حاصل کریں۔ اسی کے اندر ان کی حقیقی نجات کا سامان ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۰۹)

نومبر ۱۹۴۵ء میں انہوں نے نئی دہلی کی مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس کے نام ایک پیغام میں ملت کے شاہین بچوں کو یہ دعوتِ عمل دی کہ:۔

آج پاکستان ہماری وہ منزلِ مقصود ہے جس کے لئے ہم برسرِ جنگ ہیں اور اگر ضرورت پڑی تو اس کے لئے جانوں کی بازی بھی لگائیں گے۔ اسے سودے بازی کا معاملہ نہ سمجھئے۔ میں نوجوانانِ ملت سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس کے لئے کمریں کس لیں اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کی صلاحیتوں کو اجاگر کریں۔ ہماری امیدیں ملت کے نوجوانوں سے وابستہ ہیں (ایضاً صفحہ ۳۰۶)

"قائداعظم کے ان اعلانات نے ملت کے قلب و نظر کو نئی روشنی عطا کی۔ افرادِ ملت نے مدتوں کے قومی انتشار اور بے راہ روی کے بعد پہلی بار اپنی منزلِ مقصود اور اس کے نشانات کو نگاہوں کے سامنے پایا۔ ان کے دلوں میں ذوقِ سفر کے ولولے اور مشکلات و موانعات سے ٹکرانے کے بھرپور عزائم انگڑائیاں لینے لگے۔ ایک طرف عالمگیر جنگ کا آغاز ہو چکا تھا اور برطانوی سلطنت کا سفینہ ابتلا و آزمائش کی طوفانی لہروں کے حصار میں تھا اور دوسری طرف ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں اپنے قائد کے اشاروں پر ایک

مقام میں صف آرا ہو چکے تھے۔ اپنی زندگی اور موت کی جنگ میں آقایانِ فرنگ نے صورتِ حالات کا جائزہ لیا۔ اور اس سے متاثر ہو کر وائسرائے ہند نے یہ اعلان کیا کہ ہندوستان کے آئندہ آئین میں مسلمانوں کی اہمیت کو پوری طرح پیشِ نظر رکھا جائے گا اور ملک کی حکومت کسی ایسے عنصر کے سپرد نہیں کی جائے گی جس پر انہیں اعتماد نہ ہو۔

سیکرٹری آف سٹیٹ کا اعلان

وائسرائے کے اس اعلان کے ساتھ ہی ۱۴ اگست ۱۹۴۰ء کو سیکرٹری آف سٹیٹ (وزیر ہند) مسٹر ایمری نے دارالعلوم میں مسئلہ ہند پر تقریر کرتے ہوئے نہایت واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ۔

کانگرس کے اس دعوے کی تردید کرا سے تمام ہندوستان کی طرف سے بولنے کا حق ہے، ہندوستان کی پیچیدہ زندگی کے ایک بہت اہم عنصر کی طرف سے ہوتی ہے۔ یہ دوسرا عنصر دعویٰ کرتا ہے کہ ان کو صرف اقلیت تصور نہ کیا جائے بلکہ وہ ہندوستان کے مستقبل کی پالیسی میں ایک علیحدہ عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہندوستان کے آئندہ آئین کی تشکیل کے متعلق جو گفتگو بھی ہو اس سلسلے میں انہیں ایک مستقل قوم تصور کرنا چاہیئے۔ یہ سب سے اہم عنصر نو کروڑ افراد پر مشتمل مسلمان قوم ہے جو شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں میں اکثریت رکھتی ہے...... ان کا یہ دعویٰ ہے کہ آئینی مذاکرات میں ان کو یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ بحیثیت ایک مستقل قوم کے متصور کئے جائیں اور وہ تہیہ کر چکے ہیں کہ ان کے نزدیک وہی دستور قابلِ قبول ہو گا جس میں ایک قوم کی حیثیت سے انہیں ایک عددی اکثریت کے خلاف اپنے سیاسی تشخص کا پورا تحفظ حاصل ہو۔

(انڈیا اینول رجسٹر ۱۹۴۰ء۔ جلد ۲۔ ص ۳۷۵)

ایک طرف مسلم لیگ کی بڑھتی ہوئی قوتِ تنظیم اور دوسری طرف حکومت برطانیہ کی طرف سے اس قوت کا اعتراف یہ سب کانگرس کے حواس باختہ ذہن پر بوکھلاہٹ طاری کرنے کے لئے کافی تھا۔ گاندھی جی نے اس موقع پر اپنی جاہتمانی سیاست کے سارے ہتھکنڈوں کو استعمال کیا۔ انہوں نے ہندو پریس کے زور پر مخالفانہ پروپیگنڈے اور افترا پردازیوں کی مہم چلائی۔ مسلم لیگ کی صفوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے یو۔ پی اور دیگر صوبوں میں مسلم لیگی لیڈروں کو وزارتوں میں شریک کرنے کا لالچ دیئے اور پھر راج گوپال اچاریہ کے ذریعے یہ خطرناک پیش کش بھی منظرِ عام پر لائی گئی کہ ملک کی آزادی کی خاطر کانگرس یہ اختیار قائداعظمؒ کے سپرد کرنے کو تیار ہے کہ وہ عبوری گورنمنٹ میں حسبِ منشاء اپنا وزیراعظم اور کابینہ نامزد کر سکیں۔ لیکن قائداعظمؒ اور ان کے رفقاء کو اس دامِ تزویر کا شکار نہ بنایا جا سکا۔ اور بساطِ سیاست پر انہوں نے جس مہرے کو بھی حرکت دی وہ قائداعظمؒ کی بیشانی فراست اور حسنِ تدبر سے مات کھا گیا۔

(-)

طلوعِ اسلام نہ ملنے کی شکایت شکایت موصول ہونے پر مندرجہ تاریخ تک پرچہ دوبارہ ارسال کیا جائے گا۔ اسکے بعد اطلاع آنے پر اگر موجود ہوا تو قیمتاً بھیجا جائے گا۔ خط و کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ ضروری ہے۔ (ناظم ادارہ)